

مصطفیٰ زیدی

میری لائبریری

قبائے
ساز

میری لائبریری

تحریر

قبائے ساز

مصطفیٰ زیدی



مشاعروں کے رنگوں، ڈرائنگ روم کی پرسٹ ڈیزائننگ، اور
 جنگامی حالات کے خطبوں سے بلند و بالا ایک ایسا مقام شعر ہے جس کا
 اوراک صرف انہی کو ہو سکتا ہے جو انفرادی اور جماعتی سازشوں سے
 بے نیاز ہو کر اپنے دل کے خلوت کدے میں تہذیب اور ریاض کی
 جوت جگائیں۔ "قبائے ساز" کا شاعر کسی حلقے کے آگاہ اور کسی
 زمانے کی چار دیواری میں قید نہیں، لیکن اُس کی اپنی تنہائی کے
 ستارے میں کسی زمانے گم ہیں، ایک طرف اُس نے ناویڈ اور مہم
 لاکھود کو اپنے جسم اور اپنی پرچائیں میں شامل پایا ہے، اور دوسری
 طرف یہی جسم کبھی عشق کی آنچ اور کبھی گناہ کی بجٹی میں پتا ہے۔
 صداقت کا یہی اعلان، مُحَظَّفَہ زیدی کے کلام کا مشور ہے، اور
 فسادِ خلق و فسادِ ذات کے انہی رنگ برنگ تاروں سے اُنھوں
 نے اپنے ساز کا آہنگ مرتب کیا ہے۔

قبائے ساز

مصطفیٰ زیدی

فیض احمد فیض نے ایک جگہ کہا ہے کہ ہمارے نوجوان شعرا میں
مصطفیٰ زیدی کے علاوہ بہت کم ایسے ہوں گے جنہیں صحیح معنوں میں صاحب
طرز کہا جاسکے۔ یوں محض نئی طرز ایجاد کر لینا تو کچھ ایسا کمال نہیں لیکن ایسی طرز
جو قدیم و جدید فکر و بیان کے محاسن سے مالا مال اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے
اہل کمال کی کاوشوں سے تمیز بھی ہو، صرف اہل دل کے خرقہ راسخ کا جھنڈ ہے۔

جمیل نشر کے نام

راز کے کہ بر غیر نگفتم و نگویئیم
بار دست بگوئیم کہ از مرم راز است

دِن کی اک اک بُند گراں ہے، اک اک جُرمِ شبِ نایاب
شام و سحر کے پیمانے میں جو کُچھ ہے، ڈر ڈر کے پیو
اچستہ آچستہ بر تو ان گہستی کی سانسوں کو
دل کے بات میں شیشہ جاب ہے، قطرہ قطرہ کر کے پیو

”نغمگی کے متدبلا پر قبائے ساز تنگ“

بُخاری

تار و پود

دل میں دُور درو نہاں ہے کہ بتائیں کس کو ۱۱

زخمِ سفر ۱۳

محد ۲۳

آدی ۲۶

کیا کیا نظر کو شوقِ ہوس دیکھنے میں تھا ۲۸

عہد ۲۹

تحقیق ۳۰

تبدیل ۳۲

تکلف ۳۳

اندیشہ ہائے دُور و دراز ۳۶

تہ ۳۸

کفِ مومن سے نہ ویرانہ دُوریاں سے ۴۰

پستی ۴۱

لبِ مرگ ۴۲

سایہ ۴۴

دروہل بھی منہم دوریاں کے برابر سے اُٹھا ۴۵

حالِ احوال ۴۶

کو نہیں ریت سے پھونسیں گی سر و شبِ دنیا ۴۸

جس دن سے اپنا نرِ حقیرانہ چھٹ گیا ۴۹

شہرِ جنوں میں ہیں ۵۰

غمِ دُوریاں نے بھی کیسے غمِ یادیں کئے تھیں ۵۱

منزلِ منزل ۵۲

کارواں ۵۳

نئی آبادی ۵۵

روکنا ہے غمِ انہما سے پندار ہے ۵۶

ڈھسے گئی رات، آئے گی سحرِ آہستہ آہستہ ۵۸

اندھی چلی تو نفسِ کفِ پانیوں ۵۹

واقعہ نہیں اس راز سے آشتی سراں بھی ۶۰

دستور ۶۱

ذنب ۶۳

زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے ۶۵

سفرِ آخرِ شب ۶۶

انہیس ۶۸

ناشائس ۷۰

ناشائس ۷۲

رو و ہم آشنائی ۷۴

بجھ گئی شمعِ حرمِ بابِ کھسانہ کھلا ۷۶

اسے آدم کو پرورد ۷۸

ایک شام ۸۰

تری بنی ۸۴

اس قد رآب غم دوراں کی فرودانی ہے ۸۶

طیارہ ۸۷

ارہوش ۸۸

جب ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہنچ آئی ۹۰

ہم کافروں کی مشق سنیں پائے گفتنی ۹۱

بزم میں باعث تاخیر ہو کر تے تھے ۹۲

نہاں ہے سب سے مراد درجہ سینہ عیاب ۹۳

بے ہمتی ۹۶

کاروبار ۱۰۲

ساری محفل طُف بیاں پر مجوم رہی ہے ۱۰۳

بازار ۱۰۴

رشدِ جام و سُبُو ۱۰۶

ایک گنہام سپاہی کی قبر پر ۱۰۸

ایک نوحہ ۱۱۰

آواز کے سائے ۱۱۲

یہ آدمی کی گزرگاہ ۱۱۴

گانے والیاں ۱۲۱

دیوانوں پہ کیا گزری ۱۲۲

گفت و گو ۱۲۴

فسرار ۱۲۵

قطعات ۱۲۷

محبت ۱۳۱

تخرانہ ۱۳۲

ہارجیت ۱۳۵

فساد ذات ۱۳۶

ایسی گھریں ۱۳۸

دُہ لہنی ۱۴۰

اعتراف ۱۴۲

توہمِ شمعِ دل دیدہ ۱۴۴

مذبح ۱۴۶

ایک حصرانہ ۱۴۹

سہرا ۱۵۰

ہم لوگ ۱۵۲

رفتگاں ۱۵۴

سودا ۱۵۵

اندوہ و غم ۱۵۶

وصال ۱۵۸

فساق ۱۶۰



دل میں وہ درد نہاں ہے کہ بتائیں کس کو
ہاں اگر ہے تو کوئی مخدومِ اسرارِ مئے

خلوتِ ذہن کے ہر راز کی سرگوشی کو
یہ نہ ہو جائے کہ بازار کا بازارِ مئے

نرمیِ رمزدکنیہ کا تقاضا یہ ہے
پر تو شاخِ کمرے، سایہِ دیوارِ مئے

ہونٹ چلنے بھی نہ پائیں کہ معافی کھل جائیں
لمحہ شوقِ کمرے، ساعتِ دیدارِ مئے

میں تو سو مرتبہ تیشے کی زباں سے کہہ دوں
تو جو افسانہٴ سندھ باد بس اک بارِ مئے

زخمِ سفر

ہزار راہِ مُغیلاں ہے کارواں کے لیے
 ہو کارنگ ہے تزیینِ وِستاں کے لیے
 قدمِ قدم پہ بڑی سختیاں ہیں جاں کے لیے
 کئی فریب کے عشوے ہیں امتحاں کے لیے
 زمانہ یوں تو ہر اک پر منظر نہیں کرتا
 قلم کی بے ادبی درگزر نہیں کرتا

قلم میں لہزشِ مرگاں، قلم میں رشتہ جاں
 قلم میں زمزمہ و زم، قلم میں شور و فغاں
 قلم میں جشنِ عروسی، قلم میں بیوگیاں
 قلم میں کوہ و بیاباں، قلم میں کابکشاں
 قلم میں حلم بھی ہے ناز اور وقار بھی ہے
 اذانِ صبح بھی ہے، شامِ بادہِ خوار بھی ہے

اسی کے دم سے گھٹاؤں کے سُرمئی آنچل
 اسی سے ہوٹ بہاراں، اسی سے آنکھ کنول
 یہی گُلاہ کا ہیرا، یہی کسان کا ہل
 یہی ہے صبحِ گلستاں، یہی شبِ متصل
 بغیر اس کے رہِ سروری نہیں ملتی
 کسی کو دولتِ پیغمبری نہیں ملتی

چمن ہزار ہیں، لیکن گلاب اس کا ہے
 خدا کا عرش ہے لیکن سحاب اس کا ہے
 کبھی جو ڈھل نہ سکے، شباب اس کا ہے —
 ہر ایک عہد کی آنکھوں میں خواب اس کا ہے
 دیارِ عشق میں مجروح و بے وطن یہ ہے
 حرمِ حسن میں خوشنوائے پرین یہ ہے

دنوں میں ہم نہ کارِ سازِ اس کا ہے
 شبوں میں زمزمہٴ دل نوازِ اس کا ہے
 بطون میں ابدیت کے رازِ اس کا ہے
 سرِ شک و قت کے ہیں اور گدازِ اس کا ہے
 مثالِ حضرتِ آدم گناہ گار بھی ہے
 حسدِ عیسیٰ عیسیٰ کا پردہ دار بھی ہے

ہر اک سے بے خبری بھی، ہر اک کا محرم بھی
 شرابِ سینہ بھی ہے اور لبِ شبِ بنم بھی
 محلِ زخم بھی ہے اور مفتابِ مریم بھی
 ہلالِ عید بھی ہے، عشرۃٴ محرم بھی
 بغاوتوں کے درخشاں صم اٹھائے ہوئے
 جگر کے طاق میں شمعِ بیں جلانے ہوئے

قلم کی راہ میں جو آئے دل کو مار کے آئے
 شب و روزِ غم بے کراں گزار کے آئے
 گلے سے طوقِ زمان و مکاں ناتار کے آئے
 بڑے بڑوں کو باگمبِ ہل پکار کے آئے
 بہت جہادِ طلب ہے رہِ وفا اس کی
 کہ انتہائے جنوں سے ہے ابتدا اس کی

ادھر بلاؤں پہ جو مسکرا سکے وہ آئے
 جو تاج و تخت پہ ٹھوکر لگا سکے وہ آئے
 جو آسمان کو نیچا دکھا سکے وہ آئے
 جو اپنے آپ سے آنکھیں لڑا سکے وہ آئے
 رولے زر کا نہیں جو کفن کا شیدا ہو
 ادھر وہ آئے جو دار و رسن کا شیدا ہو

جسے خبر ہو کہ کس نے نقاب اٹھائی ہے
 یہ عہدِ گُزنہ ہے یا عصرِ مومنائی ہے
 یہ عادی ہے کہ مُرود کی خدائی ہے
 یہ خونِ دل ہے قلم میں کہ روشنائی ہے
 جو نقش و رنگ سے آدابِ ساوگی پُوچھے
 جو خسروی سے مزاجِ جہنم کشتی پُوچھے

جو خشتِ حرف سے دیوار و در بناتا ہو
 نفس کے لوچ سے تیغ و تبر بناتا ہو
 جو آندھیوں میں بتاروں کے گھر بناتا ہو
 جو خودِ طلسمِ قفسِ اوقدَر بناتا ہو
 جو ایک سانس میں طے راہِ کائنات کرے
 خدا سے بھی نہ، سرِ شہزادِ ب کے بات کرے

کہاں مقامِ مٹن اور کہاں سیاستِ شب
 کہاں یہ اشک کہاں تاجرانِ حشرِ طرب
 کہاں تجزّی کی بلندی کہاں پہلے ہوئے لب
 کہاں زمان و مکاں اور کہاں عرق و عرب
 حد و دِشام و سحر سے نکل گئے کچھ لوگ
 ذرا سی دُھوپ میں آکر پھل گئے کچھ لوگ

کسی نے دولتِ فانی کو دیوتا جانا
 ادب کو رزقِ کمانے کا مشغلا جانا
 جگر کے خون کو رنگینیِ صفا جانا
 بیتانِ سیکلِ اوپام کو حشرِ ادا جانا
 غمِ حیات کو بے مدعا بن اڈالا
 ہنر کو، کاسۂ دستِ گدا بن اڈالا

آبِ ان میں ذہن کی بازی گری کے قہے ہیں
 بجائے اطلس و تارِ زری کے قہے ہیں
 رئیسِ وقت کی پیغمبری کے قہے ہیں
 ظلم ہو شرِ باکی پر ی کے قہے ہیں
 دُھواں دُھواں ہے فضا، بحرِ سامری کی طرح
 ضعیف آنکھوں کی دُھندلی سی روشنی کی طرح

خُمِ شکستہ تاج و نگین کے چرچے ہیں
 ادائے یلی جنتِ نقشب کے چرچے ہیں
 مجاہداتِ فریبِ آفریں کے چرچے ہیں
 مکاشفاتِ بزرگانِ دیں کے چرچے ہیں
 کوئی رکوع میں ہے خانقاہ کے آگے
 کوئی سجود میں ہے کج کلاہ کے آگے

سُنو قلم کے مہمات جاننے والو
 دلِ حیات کے ضربات جاننے والو
 مِزاجِ ارض و سِماوات جاننے والو
 ادب کے جُملہ مقامات جاننے والو
 تمہیں نہ صرف بہشتاں میں جا کے لکھنا ہے
 ہر ایک عہد کے زنداں میں جا کے لکھنا ہے

پُک ہے ایک حقیقت نہیں کمان بھی ہے
 زمین بھی ہے، فضا بھی ہے، آسمان بھی ہے
 جو کاٹ دی ہے حکومت نے فُضبان بھی ہے
 ٹکونٹوں پہ جو گُذری وہ داستان بھی ہے
 عتاب و لطف و سزا و جزا کا قصہ ہے
 رستم کرو کہ یہ قصہ وفا کا قصہ ہے

لکھو کہ تابع شاہی نہیں مزاج عوام
 تھکت کھا کے رہے گی چراغ سے ہر شام
 ہر ایک عہد میں ہوں گے ہزار گل اندام
 ہر ایک عہد میں آئے گا عشق پر الزام
 جہاں بھی مطلع حق پر حساب اُٹھے گا
 کسی قلم سے کوئی آفتاب اُٹھے گا

حمد

ہم نے اُس قوتِ موہوم کو دیکھا نہ سنا
ہم نے اُس گوہرِ نادیدہ کو پرکھا نہ چُنا

اک سواری کہ شناسا نہ تھی، گھر پر اُتری
اک تجلی تھی کہ تہذیبِ نظر پر اُتری

جلوے دیکھے جو کبھی شاملِ ایماں بھی نہ تھے
اور ہم ایسے تن آساں تھے کہ حیراں بھی نہ تھے

دل کے آغوش میں اک نورِ ہمکتا آیا
ایک لمحہ کتنی صدیوں پہ چمکتا آیا

دہم و تیشیک سے الہامِ شعاری نہ رُکی
شب سے شہزادۂ خاور کی سواری نہ رُکی

پتھروں کے صَدَفِ تیرہ سے میرے ابھرے
بے کراں موج سے بے نام جزیرے ابھرے

آہیں گونج اُنہیں حکمتِ گویا کے بغیر
 شعلیں جلنے لگیں شعلہٴ سینا کے بغیر

نکبت بے بصرِاں دیدہ وری تک پہنچی
 ضربِ شیشے پہ لگی، شیشہ گری تک پہنچی
 اجنبی شہر سے اک بُوئے چمن ساز آئی
 دم بخود، مہرب لب، وقت سے آواز آئی

رات کا کرب بھی یں، صُبح کا آرام بھی یں
 حد و بے حد بھی یں، بے نام بھی یں، نام بھی یں

صحرا خاموش بھی یں، حلقہٴ آواز بھی یں
 دستِ محمود بھی یں، آذرِ بُت ساز بھی یں

سنگ و سنباب بھی ہوں، شعلہ بھی ہوں، خاک بھی ہوں
 میں ترا وہم بھی ہوں، یں ترا ادراک بھی ہوں

ساز کی گونج بھی ہوں، تیغ کی جھنکار بھی ہوں
 میں کڑی دھوپ بھی ہوں، سایہٴ دیوار بھی ہوں

میرای سوزِ خموشی ہے ہر آہنگ کے ساتھ
میری ہی نرمیِ مسلک ہے رگِ سنگ کے ساتھ

میری رُوداد دُہی ہے جو جہاں پر گزری
لامکاں پر بھی وہ گزری جو مکاں پر گزری

گردشیں تجھ سے ملیں تو مرے پاس آئیں بھی
میں ترا جسم بھی ہوں میں تری پر چھائیں بھی“

آدمی

مجھ کو محسوس کیا ہے مری آگاہی نے
 میں نے آفاق کا پابند نہ دیواروں کا
 میں نے شبِ بنم کا پرستار نہ انگاروں کا
 نہ خلاؤں کا طلب گار نہ سیاروں کا

زندگی دھوپ کا میدان بنی جمنی ہے
 اپنا سایہ بھی گرِ نِزاں، تیرا داماں بھی خفا
 رات کا رُوپ بھی بے زار چہرناں بھی خفا
 صبحِ یاراں بھی خفا، شامِ حریفان بھی خفا

خود کو دیکھا ہے تو اس شکل سے خوف آتا ہے
 ایک مبہم سی صدا گنبدِ افلاک میں ہے
 تارِ بے مایہ کسی دامنِ صد چاک میں ہے
 ایک چھوٹی سی کرنِ مہر کے ادراک میں ہے
 جاگ اُے رُوح کی عظمت کہ مری خاک میں ہے

کیا کیا نظر کو شوقِ ہوس دیکھنے میں تھا
 دیکھا تو ہر جمالِ اسی آئینے میں تھا
 قلزم نے بڑھ کے چوم لیے پھول سے قدم
 دریائے رنگ و نور ابھی راستے میں تھا
 اک موجِ خونِ خلق تھی، کس کی جہیں پر تھی؟
 اک طوقِ فردِ جرم تھا، کس کے گلے میں تھا؟
 اک رشتہ وفا تھا سو کس نا شناس سے
 اک دردِ حرزِ جاں تھا سو کس کے صلے میں تھا
 صہبائے تند و تیز کی جدت کو کیا خبر
 شیشے سے پوچھئے جو مزا ٹوٹنے میں تھا
 کیا کیا رہے ہیں حرف و حکایت کے سلسلے
 وہ کم سخن نہیں تھا مگر دیکھنے میں تھا

تائب تھے احتساب سے جب سارے بادہ کش
 مجھ کو یہ افتخار کہ میں مئے کدے میں تھا

طَلسم

بُجھ گیا ہے وہ ستارہ جو مری رُوح میں تھا
کھو گئی ہے وہ حرارت جو تری یاد میں تھی

وہ نہیں عشرتِ آسودگی منزل میں
جو کسکِ جاوہِ گم گشتہ کی اُفتاد میں تھی

دُورِ اک شمعِ لرزتی ہے پس پردہ شب
اک زمانہ تھا کہ یہ کو مری فریاد میں تھی

ایک لاوے کی دھمک آتی تھی کُہاروں سے
اک قیامت کی تپش تیشہ فریاد میں تھی

ماہِ سخنِ ساعتِ امروز کہاں سے لائے
وہ کہانی جو نظر بندِیِ اجداد میں تھی

تَحْسِیق

کتنے جاں سوز مراحل سے گزر کر دل نے
کس قدر تیج و خیم سود و زیاں دیکھے ہیں

کتنے گردِ آبِ نظر آتے ہیں دُف کے نزدیک
کتنے بھونچال سرِ آبِ رواں دیکھے ہیں

گو نچتے ساز، برستے ہوئے نعموں کے قریب
دل کو تھامے ہوئے اُربابِ مغان دیکھے ہیں

ڈوبنے والوں کے ہمراہ بھٹور میں رہ کر
لبِ ساحل کے ضیا بارِ مکال دیکھے ہیں

جام کے رنگ میں پاتی ہے لہو کی سُرخ
کاہ کے دوش پہ سو کوہِ گراں دیکھے ہیں

مَدّتوں اپنے دل زار کا ماتم کر کے
خود سے بڑھ کر بھی کئی سوختہ جاں دیکھے ہیں

سُسناتے ہوئے ذرات کے رُخساروں پر
تند سُرُوج کے طمانچوں کے نشان دیکھے ہیں

موت کو جن کے تصور سے پسینہ آجائے
سینہ زیست میں وہ زخم نہاں دیکھے ہیں

تب کہیں جا کے ان اشعار کے گہوارے میں
اک بصیرت کے ٹکٹے کے نشان دیکھے ہیں

تہدیہ

سرور و کیف کے آیات لے کر آیا ہوں
نگاہِ پیرِ حنرا بات لے کر آیا ہوں

زمین کے کرب میں شامل ہوا ہوں راہِ رو
دل شکستہ کی سوغات لے کر آیا ہوں

نظر میں غصہِ جواں کی بغاوتوں کا غرور
چکر میں سوزِ روایات لے کر آیا ہوں

جہان تیرہ کی خاموشیوں کے حلقے میں
چسپاںِ حرف و حکایات لے کر آیا ہوں

کہ صر ہے چشمِ حیواں مرا طواف کرے
گناہِ کار ہوں، ظلمات لے کر آیا ہوں

بلند و پست سے کہہ دو کہ صف میں آجائیں
 زمیں پہ ذوق مساوات لے کر آیا ہوں

بہت سے آئے ہیں تیری گلی میں لیکن میں
 متاعِ عزتِ سادات لے کر آیا ہوں

تشنگ

مجھ کو دیے

اکثر خداؤں نے بہ طور پیش کش دُنیا و دیں
میں، مُصطفیٰ زیدی، ضعیف الاعتقاد و کم یقیں

لیکن نہیں

اے پڑھنے والو تم کو شاید اس کا اندازہ نہیں
جن راستوں سے ہو کے آیا ہے یہ دورِ آخری

اس میں ملے

صحرا، بگولے، دشت، دریا، آگ، نفرت، تیزی
الحان، گلشن، رنگ، خوشبو، پیار، کوئیل، انگلیں

اکثر یہ گھر
پنیریوں کی سانس کی شمعیں نہ روشن کر سکیں
اکثر اسے نو دے گئی ابلیس کی تیرہ جہیں

دُنیا نے بھی
دل پر مرے نقشِ جوئے چھوڑے نہیں حالِ اکوڑہ
سج دھج کے نکلی بھی مشالِ عُبتانِ مصرِ چہیں

اُس ذات کے
بالے میں اک عُقتے کے پیچھے سیکڑوں عُقتے بنے
ہے یا نہیں کے بعد
ممکن ہے
کہ ممکن بھی نہیں

اندیشہ ہائے دور و دراز

اب سے پہلے بھی اس محفلِ رقص میں گھنگڑوں کے چھناکے پھرتے رہے
 قبل اور وسط اور حال کے قافلے سب اسی راستے سے گزرتے رہے
 مندروں میں کھٹکتی رہیں گھنٹیاں مسجدوں کے منارے ابھرتے رہے

اب سے پہلے بھی آسودگی کے لئے آسماں کی طرف آنکھ اٹھتی رہی
 اب سے پہلے بھی حُسنِ سفر کے لئے لکشاں کی طرف آنکھ اٹھتی رہی
 اب سے پہلے بھی تحقیق سے بدگماں اِعتقادات کی بات کرتے رہے

خوبصورت سی اک ناؤ دے کر سخن کرنے لہروں کے چکر میں ابھار دیا
 معتبر رہنماؤں نے دھوکے دیے، خضرِ صورت بزرگوں نے بہکا دیا
 خضرِ صورت بزرگوں کی آنکھوں میں تقدیس کے سُرخ ڈوے ابھرتے رہے

آدمی کے تراشے ہوئے دہم نے آدمی کے لیے خار و خس چُن دیے
 قیصروں سے غلامی کا تمغہ ملا، دیوتاؤں نے افلاس کے اُن دیے
 پاک پروردگارِ مہر کی رحمتوں سے اندھیرے نکھرتے رہے

چشمِ مشتاق کو رُخ کی تابانیاں دیکھنے کی سعادت نہیں مل سکی
 شام گزرے بھی مدت ہوئی اور ابھی آئینے کو اجازت نہیں مل سکی
 صبح بھی تجھ سے پوچھیں گے اُسے دردِ دل تیرے گیسو کہاں تک سنوتے رہے

تہا

میں دُہی قطرہ بے بحر دُہی دشت نورد
 اپنے کاندھوں پہ اٹھائے ہوئے صحرا کا طلسم
 اپنے سینے میں چھپائے ہوئے سیلاب کا درد
 ٹوٹ کر رشتہ ریشم سے آ نکلا ہوں
 دل کی دھڑکن میں دبائے ہوئے اعمال کی فرد
 میرے دامن میں بستے ہوئے لمحوں کا خروش
 میری پلکوں پہ بگولوں کی اڑائی ہوئی گرد

لاکھ لہروں سے اٹھا ہے مری فطرت کا خمیر
 لاکھ قلزم مرے سینے میں دواں رہتے ہیں
 دن کو کیرئیں مرے افکار کا مُنہ دھوتی ہیں
 شب کو تارے مری جانب بگراں رہتے ہیں

میرے ماتھے پہ جھلکتا ہے ندامت بن کر
ابن مریم کا وہ جلوہ جو کلیسا میں نہیں

رائدہ موج بھی ہیں، مجرم ذات بھی ہیں

میراقصہ کسی افسانہ دریا میں نہیں
میری تاریخ کسی صفحہ صحرایں نہیں



کھٹ مومن سے، نہ دروازہٴ دوراں سے ملا
رشتہٴ درد اُسی دشمنِ ایماں سے ملا

اِس کار و نالِ بے کہ پیاں مہکنی کے باوصف
وہ شکر اُسی پیشانیِ خنداں سے ملا

طالبِ دستِ ہوس اور کئی دامنِ فتنے
ہم سے ملتا جو نہ یوسف کے گریباں سے ملا

کوئی باقی نہیں اب ترکِ تعلق کے لئے
وہ بھی جا کر صفِ احبابِ گریزاں سے ملا

کیا کہیں اُس کو جو محفل میں شناسا بھی نہ تھا
کبھی خلوت میں در آیا تو دل و جاں سے ملا

میں اُسی کوہِ صفتِ خون کی اک بوند ہوں جو
ریگ زارِ نہج و خاکِ خراساں سے ملا

سچائی

مشرق کے پنڈت، مغرب کے گرجا والے
 صُبح ہوئی اور سچائی کے پیچھے بھاگے
 سچائی اک قجہ تھی جو رات کو تھک کر
 سوئی ہوئی تھی، شور مٹا تو خوف کے مارے
 تھر تھر کانپی، روزِ عدالت سے گھبرائی
 بھیس بدل کر پیچھے ہٹ گئی، آگے آگے
 مشرق کے پنڈت، مغرب کے گرجا والے

لبِ مرگ

قوم کے پاس اب رہا کیا ہے
 شاعرانہ تعسیوں کے سوا
 ہیں معالج مگر دوا کیا دیں
 جانکنی میں، تسیوں کے سوا

سایہ

تمام شہر پہ آسیب سا مُسلط ہے
 دُھواں دُھواں ہیں دیر بچے، ہوا نہیں آتی
 ہر ایک سمت سے چھین سنائی دیتی، میں
 صدائے ہم نفس و آتشنا نہیں آتی

گھنے درخت، دردِ بام، نغمہ و فائوس
 تمام سحر و طلسمات و سایہ و کابُوس
 ہر ایک راہ پہ آوازِ پائے نامعلوم
 ہر ایک موڑ پہ ارواحِ زشت و بد کا جلوں

سفید چاند کی مجلسِ قبائے سبہاں پر
 سیاہ و سرد کفن کا گماں گزرتا ہے
 فضا کے تخت پہ چمکا دڑوں کے حلقے میں
 کوئی خلا کی گھنی رات سے اُترتا ہے

تمام شہر پہ آسیب سا مُسلط ہے
 کوئی چراغِ جلاؤ، کوئی حدیث پڑھو
 کوئی چراغِ برنگِ عذارِ لالہ رُحناں
 کوئی حدیثِ باندہِ صدقہٗ دل و جاں
 کوئی کُرنِ پئے تزیینِ غُرفہ و محراب
 کوئی نوا یئے در ماندگان و سوختہ جاں

سنا ہے عالمِ رُوحانیاں کے خانہ بدوش
 سحر کی روشنیوں سے گریز کرتے ہیں
 سحر نہیں ہے تو مشعل کا آسرا لاؤ
 لبوں پہ دل کی شگفتی ہوئی دھما لاؤ
 دلوں کے غمِ طہارت کے واسطے جا کر
 کہیں سے خونِ شہیدانِ نینوا لاؤ

ہر اک قبا پہ کثافت کے داغ گرے ہیں
 لہو کی بوند سے یہ پیرِ مہن دھلیں تو دھلیں
 ہوا چلے تو چلے، بادِ باں کھلیں تو کھلیں

دردِ دل بھی غمِ دُوراں کے برابر سے اُٹھا
 آگ صحرا میں لگی اور دُھواں گھر سے اُٹھا

تابشِ حُسن بھی تھی، آتشِ دُنیا بھی، مگر
 شعلہ جس نے مجھے پھونکا مرے اندر سے اُٹھا

کسی موسم کی ہفتیہ روں کو ضرورت نہ رہی
 آگ بھی، اُبر بھی، طوفان بھی ساغر سے اُٹھا

بے صدق کتنے ہی دریاؤں سے کچھ بھی نہ ہوا
 بوجھِ قطرے کا تھا ایسا کہ سمندر سے اُٹھا

چاند سے شکوہ بلب ہوں کہ سُلا یا کیوں تھا
 میں کہ خورشیدِ جہان تاب کی ٹھوکر سے اُٹھا

حال احوال

ایک اکیلے ہم ایسے جو آدھی رات ڈھلے
چھوڑ کے کابکشاں کا رستہ انگاروں پہ چلے

سچائی کی منزل جگمگ جگمگ کرتی ہے
لیکن اُس تک کیسے پہنچیں راہ میں آگ جلے

عہدوں کے دُہ پونے آئے کچھ لوگوں کے ہات
صبح کو جن کا بیج لگے اور شام کے وقت پھلے

کیسے کیسے سنگھاسن ے کر بیٹھ گئے عینار
مُلا، پنڈت ڈاکو، افسر ایک سے ایک بھلے

کوئی خرد کی مِخل میں اقوال و کمال بتائے
کوئی بزمِ جمال سجائے جام پہ جام ڈھلے

اک پرچم کا نشان کبوتر اور اک کا شہباز
وہی زمین کے خون کے پیاسے ہر پرچم کے تلے

افسانوں کے ٹکٹ کے پیچھے روتی ہوئی تاریخ
ظلم کی تلواروں کے نیچے مظلوموں کے گلے

زیدی اب سیاسی بن کر ہم لے لیں بن باس
ہاتھ پر سینہ دور لگائے منہ پر راکھ غلے

کو پتلیں ریت سے پھوٹیں گی سرِ دشتِ وفا
آبیاری کے لیے خُونِ جگر تو لاؤ

کسی گھونگٹ سے نکل آئے گا رُخسار کا چاند
جو اُسے دیکھ سکے ایسی نظر تو لاؤ

شہر کے کوچے و بازار میں سناٹا ہے
آج کیا سانجھ گزرا ہے خبر تو لاؤ

ایک لمحے کے لیے اُس نے کیا ہے اقرار
ایک لمحے کے لیے عمرِ خشنود تو لاؤ



جس دن سے اپنا طرزِ فقیرانہ چھٹ گیا
شاہی تو بل گئی دلِ شاہانہ چھٹ گیا

کوئی تو غمگسار تھا کوئی تو دوست تھا
اب کس کے پاس جائیں کہ ویرانہ چھٹ گیا

دُنیا تمام چھٹ گئی پیمانے کے لئے
دُہمے کدے میں آئے تو پیمانہ چھٹ گیا

کیا تیز پا تھے دِن کی تمازت کے قافلے
ہاتوں سے رشتہ شبِ افسانہ چھٹ گیا

اک دِن حساب ہو گا کہ دُنیا کے واسطے
کن صاحبوں کا مسلکِ زندانہ چھٹ گیا

شہرِ جنوں میں چل

شہرِ جنوں میں چل مری غمِ دیووں کی رات
 اُس شہر میں جہاں ترے خوں سے صفا بنے
 یوں رائیگاں نہ جائے تری آہِ نیم شب
 کچھ جنبشِ نسیم بنے کچھ دُعا بنے
 اس رات دن کی گردش بے مُود کے عوض
 کوئی غمِ دُشکرا، کوئی زاویہ بنے
 اک نعتِ انتہائے اُفق سے مُود ہو
 اک گھرِ دیارِ دیدہ و دل سے جدا بنے
 اک داستانِ کربِ کلمِ آموز کی جگہ
 تیری ہزیمتوں سے کوئی واقعہ بنے
 تو ڈھونڈنے کو جائے تڑپنے کی لذتیں
 تجھ کو تلاش ہو کہ کوئی بے دُعا بنے
 وہ سربِ خاک ہو تری چوکھٹ کے سامنے
 وہ مرحمتِ تلاش کرے تو حُدا بنے



غمِ دوراں نے بھی سیکھے غمِ جاناں کے چلن
 وہی سوچی ہوئی چالیں وہی بے ساختہ پن
 وہی استدراں میں انکار کے لاکھوں پہلو
 وہی ہوتوں پہ تبسم وہی ابرو پہ ششکن

کس کو دیکھا ہے کہ پندارِ نظر کے باوصف
 ایک لمحے کے لئے رُک گئی دل کی دھڑکن

کون سی فصل ہیں اس بارِ ملے ہیں تجھ سے
 کہ نہ پروائے گریباں ہے نہ فِکرِ دامن

اب تو چُھتی ہے ہوا برف کے میدانوں کی
 ان دنوں جسم کے احساس سے جلتا تھا بدن

ایسی سونی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی
 دل نبُجھے جاتے ہیں اے تیرگی، صُبحِ وطن

منزل منزل

آج کیوں میرے شب و روز ہیں محروم گداز
 اے مری رُوح کے نغمے میرے دل کی آواز
 اک نہ اک غم ہے نشاطِ سحر و شام کے ساتھ
 اور اس غم کا نہ مفہوم نہ مقصد نہ جواز
 میں تو اقبال کی چوکھٹ سے بھی مایوس آیا
 میرے اشکوں کا مداوا نہ بدخشاں نہ حجاز

چند لمحوں سے تمست کہ دوامی بن جائیں
 ایک مرکز پہ رہے سُرخ لہو کی پہل
 کبھی ہر گام پہ ٹھوکر، کبھی منزل منزل
 اے جہان گزراں ایک سے انداز پہ چل
 دن کو مہکی ہوئی رُت، شام کو پتی ہوئی ریت
 زندگی ایسے طلسمات کے حلقے سے بکھل

کہیں ہر لمحہ لگاوت، کہیں مٹنے سے گریز
دل مجنوب نما اور سنبھل اور سنبھل

اور کہیں یہ۔۔ کہ اگر ایک پلک بھی ٹھہرے
کوئی لمحہ۔۔ تو ہر اک سانس گراں ہو جائے
اگر اک گلشن بے خار رہے دامن وقت
یہ جہان گذراں ریگ رواں ہو جائے
ایسا مذہب کہ خود اس وجہ تعالیٰ سے گریز
ایسا اتحاد کہ سجدے میں نہاں ہو جائے

اے مری روح کے نغمے، مرے دل کی آواز
لطفِ شب تاب یہی رقصِ شر ہو شاید
کہنے کو سوں کوئی منزل نہ نشانِ منزل
جستجو ہی کوئی عرفانِ سفر ہو شاید
کوئی اتحاد میں نازاں کوئی ایمان میں گم
کبھی اس دیدہ و دل کی بھی سحر ہو شاید
میری راتوں میں نہاں ہوئے سورج کی کرن
کم بجا ہی میں ہی پوشیدہ نظر ہو شاید

کارواں

اسی طرف سے زمانے کے قافلے گزرے
 سکوتِ شامِ غریباں کے خلفشار میں گم
 ذرا سا راگِ خموشی کے دوش پر لرزاں
 ذرا سی بوند پُر اسرار آبشار میں گم
 گھنے اندھیرے میں گنّامِ راہِ رو کی طرح
 کوئی چراغ چمکتی ہوئی قطار میں گم
 فضا میں سوئی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں
 ستارے نیل کی خاموش جوبار میں گم
 شکستہ پیار کی شدت سے کانپتے ہوئے ہونٹ
 کسی کی وعدہ و فائی کے اعتبار میں گم
 نہ جانے کتنی اُمیدیں اُفق سے اکٹھ لگائے
 صحر کی آس میں منہ اُکے انتظار میں گم

نئی آبادی

سنبھل سنبھل کے چلے دوستانِ عہدِ طرب
 کوئی مستدیمِ رفاقت گلے نہ پڑ جائے
 ستم زدوں کی محبت گلے نہ پڑ جائے
 کہیں پیکار نہ لے درد کی کوئی چلمن
 کہیں خلوص کے شعلے پکڑ نہ لیں دامن
 اتر نہ جائے زرخِ دست گیر کاغذِ ازہ
 لیٹ نہ جائے قدم سے وفا کا دروازہ
 دیارِ غم کی صداقت گلے نہ پڑ جائے

ادھر تائے ہوئے دل نظر بچا کے چلے
 ضمیرِ سنگ میں شیشے کی آبرو کیا پتلی
 کھتے تھے زخمِ ستاروں کی جستجو کیا تھی
 بھجکی ہوئی تھیں نگاہیں تھے ہوئے تھے قدم
 بسی ہوئی تھیں زبانیں چلے ہوئے تھے علم
 وہ خامشی کہ سُرِ اسرارِ صدا نہ مل جائے
 وہ احتیاط کہ دردِ آشنا نہ مل جائے
 دُعا کو بات نہ اُٹھیں، پتہ نہ مل جائے

غرض کسی کو کسی سے کوئی گلہ نہ ہوا
 مہاجروں کے محلے میں حسرت نہ ہوا



روکتا ہے غنیم اظہار سے پندار مجھے
میرے اشکوں سے چھپالے مرے رخسار مجھے

دیکھ اے دشت جنوں بحید نہ کھلنے پائے
دھونڈنے آئے ہیں گھر کے در و دیوار مجھے

ہسی دیے ہونٹ اُسی شخص کی مجبوری نے
جس کی قربت نے کیا محرم اسرار مجھے

میری آنکھوں کی طرف دیکھ رہے ہیں انجم
جیسے پھپان گئی رُوح شب تار مجھے

جنسِ دیرانی صحرا میری دُکان میں ہے
کیا خریدے گا ترے شہر کا بازار مجھے

جس گُل نے کئی بار پکارا لیکن
 لے گئی راہ سے زنجیر کی جھنکار نے مجھے

ناوکِ ظلم اُٹھا، دشنہ اندوہ سنبھال
 لطف کے خنجر بے نام سے مت مار نے مجھے

ساری دُنیا میں گھنی رات کا سناٹا تھا
 صبحِ زنداں میں بے صبح کے آثار نے مجھے



ڈھلے گی رات آئے گی سحر آہستہ آہستہ
 پیو اُن انکھڑیوں کے نام پر آہستہ آہستہ
 دکھا دینا اُسے زخمِ جگر آہستہ آہستہ
 سمجھ کر، سوچ کر، پہچان کر آہستہ آہستہ

اُٹھا دینا حجابِ رسمیاتِ درمیاں لیکن
 خطاب آہستہ آہستہ نظر آہستہ آہستہ
 درجوں کو تو دیکھو، چمنوں کے راز تو سمجھو
 اُٹھیں گے پردہ ہائے بام و در آہستہ آہستہ

ابھی تاروں سے کھیلو چاندنی سے دل کو بہلاؤ
 بٹے گی اُس کے چہرے کی سحر آہستہ آہستہ

کہیں شامِ بلا ہوگی کہیں صبحِ کماں داراں
 کئے گا زلف و مژگناں کا سفر آہستہ آہستہ
 یکایک ایسے جل بجھنے میں نطفِ جاں کنی کب تھا
 جلے اک شمع پر ہم بھی مگر آہستہ آہستہ



آئندھی چلی تو نقش کف پا نہیں ملا
 دل جس سے مل گیا وہ دوبارا نہیں ملا
 ہم انجمن میں سب کی طرف دیکھتے رہے
 اپنی طرح سے کوئی ایسا نہیں ملا
 آواز کو تو کون سمجھتا کہ دور دور
 خاموشیوں کا درد شناسا نہیں ملا
 قدموں کو شوقِ آبلہ پائی تو مل گیا
 لیکن یہ طرفِ وسعتِ صحرا نہیں ملا
 کنعاں میں بھی نصیب ہوئی خود دریدگی
 چاکِ قبا کو دستِ زلیخا نہیں ملا
 مہر و دنا کے دشتِ نور و جواب دو
 تم کو بھی وہ غزال ملا یا نہیں ملا
 کچے گھڑے نے جیت لی ندی چڑھی ہوئی
 مضبوط کشتیوں کو کنارہ نہیں ملا

واقف نہیں اس راز سے آشفۂ سراں بھی
غم تیشہ فرہاد بھی غم سب گراں بھی

اُس شخص سے وابستہ خموشی بھی بیاں بھی
جو زشتہ فساد بھی ہے اور رگِ جاں بھی

کس سے کہیں اُس حُسن کا افسانہ کہ جس کو
کہتے ہیں کہ ظالم ہے توڑکتی ہے زباں بھی

ہاں یہ خیم گردن ہے یہ تابانیِ افشاں
پہلو میں برے قوس بھی ہے، کاہ کشاں بھی

اے چارہ گرد چارہ گردِ ہسم کو بتاؤ
کیا ایسے ہی آثار نمایاں ہیں وہاں بھی

چونکی ہے وہ کس ناز سے، اے صُبْحِ خوش آغاز
زُلفوں کی گھٹا بھی ہے چراغوں کا دُھواں بھی

دستور

کل رات کو محرابِ خرابات تھی روشن
اشعار کے حلقے میں تھی آیات کی آمد

اربابِ حکایت نے سبائی تھی ادب سے
افکار کے متالین پہ اقوال کی مسند

اخلاص کے رشتوں پہ چھلکتے تھے نئے جام
بادِ وضعِ تدبیرِ احسانِ آب و جد

رقبندہ و رخسندہ و تابندہ و پُرکار
جوالہ و قتالہ و سوزندہ و سرد

ہر ذرہ گراں مایہ و آفاقِ نشمن
ہر قطرہ گہرِ شستہ و الماس و زبرجد

نعموں کا تلاطم تھا کہ تفسیرِ دو عالم
ہر گیت کا اک گھیر تھا ہر بول کا اک قد

ہر دھن سے ترشتے تھے بھر کے ہوئے اصنام
ہر راگ میں اک خال تھا، ہر تان میں اک خد

گھلتا ہوا ساغر میں ہر اسلوب کم و بیش
میشتا ہوا ہر تفرقہ احمد و اسود

صہبا کی حرارت سے در کتی تھی صُداحی
بیٹھے تھے تھی جام مگر حضرت امجد

وابستگیِ شرعِ نظر بند ہی رنداں
پابندیِ آئین و گرفتاریِ مقصد

چلوں پہ اٹھائے ہوئے کُساہِ نوایہی
چہرے پہ لئے تیسر گئیِ منبر و منجد

لے جناب مجید امجد

آئندہ حرم و دیر کے مینار پکارے
اے واقف اسرارِ دل ہو مضربِ الجبد

دستورِ قوانینِ ازل مٹ نہیں سکتے
ہر شرع کا اک وقت ہے ہدایت کی اک حد

اس شہر اور اس شہر پر موقوف نہیں ہے
ذراں شود آں شہر کہ مے حنہ نہ دارو^۱

دُنیا

اک ہم ہی نہیں کُشتہ رفتارِ زمانہ
یہ شندِ ریِ رخش گذراں سب کے لئے ہے

رقاصہ طراز ہو یا بسملِ مجروح
اسبابِ دل آویزیِ جہاں سب کے لئے ہے

اک طرزِ تفکر ہے ارسطو ہو کہ خیتام
دُنیا ئے معانی و بیاں سب کے لئے ہے

خاموشِ محبت ہو کہ میدان کی للکار
مُروئیِ گفتار و زباں سب کے لئے ہے

بستی ہو فقیروں کی کہ عشرتِ گہِ کسریٰ
بُنجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں سب کے لئے ہے

درِ یوزہ گرِ شہر ہو یا خسروِ آفاق
پندارِ فلاں ابنِ فلاں سب کے لئے ہے

زبَانِ غَیْرِ سے کیسا شرح آرزو کرتے
 وہ خود اگر کہیں ملت تو گفتگو کرتے
 وہ زخمِ جس کو کیا نوکِ آفتاب سے چاک
 اُسی کو سوزِ نِ مہتاب سے رفو کرتے
 سوادِ دل میں لہو کا سُراغ بھی نہ ملا
 کسے امام بناتے کہاں وضو کرتے
 وہ اکِ طلسم تھا، قُربت میں اُس کے عمر کُٹی
 گلے لگا کے اُسے، اُس کی آرزو کرتے
 حُلف اُٹھائے ہیں مجبوریوں نے جس کے لیے
 اُسے بھی لوگ کسی روز قبضہ زد کرتے
 جنوں کے ساتھ بھی رہیں، خود کے ساتھ بھی قید
 کسے رفیق بناتے کسے عدو کرتے

حجاب اُٹھا دیے خود ہی نگارِ خالوں نے
 ہمیں دماغ کہاں تھا کہ آرزو کرتے

سفرِ آخرِ شب

بہت قریب سے آئی ہوئے دامنِ گل
 کسی کے رُوئے بہاریں نے حالِ دل پوچھا
 کہ اے فراق کی راتیں گزارنے والو
 غمارِ آخرِ شب کا مزاج کیسا تھا
 تھالے ساتھ رہے کون کون سے تارے
 سیاہ رات میں کس کس نے تم کو چھوڑ دیا
 بچھڑ گئے کہ دغا دے گئے شریکِ سفر
 اُنہج گیا کہ دف کا ظلم ٹوٹ گیا
 نصیب ہو گیا کس کس کو قُربِ سلطانی
 مزاج کس کا یہاں تک مستندانہ رہا
 نگار ہو گئے کانٹوں سے پیرہن کتنے
 زمیں کو رشکِ چمن کر گیا لہو کس کا

سُنائیں یا نہ سُنائیں حکایتِ شبِ غم
 کہ حرفِ حرفِ صحیفہ ہے، اشکِ اشکِ قلم
 کن آنسوؤں سے بتائیں کہ حال کیسا ہے
 بس اس قدر ہے کہ جیسے ہیں سرفراز ہیں، ہم
 ستیزہ کار رہے ہیں جہاں بھی اُسجھے ہیں
 شمارِ راہِ زناں سے مسافروں کے قدم

ہزار دشت پڑے، لاکھ آفتاب اُبھرے
 جہیں پہ گرد، پلک پر نمی نہیں آئی
 کہاں کہاں نہ لٹا کارواںِ فہتیروں کا
 مستاعِ درد میں کوئی کمی نہیں آئی

لائل

زباں پہ مہر گدائی ہے کس سے بات کروں
 حُرُوف کا سہ بے مایہ ہیں، قلم کشکول
 ضمیر بے حس و حرکت ہے زیت بے پہلو
 شکن ہے دامن ہستی میں ہاستین پہ جھول
 میں خود ظلم کی پریوں سے بے کینار ہوا
 کسے کہوں کہ مری رُوح کے درپے کھول

میں اک سراب کی خواہش پہ بیچ آیا ہوں
 تمام بادہ و ساعسد، تمام تشنہ لبی
 حرم عقل میں جس کا کوئی جواز نہ تھا
 نشاطِ دل مٹی وُہی زندگی کی بے سببی
 اُڑ گئے مرے گلشت، میرے رُکنا باد
 مری دُعا ئے سحر، میری آہ نیم شبی

کہاں وہ دن تھے کہ پروائے ننگ نہام نہ تھی
 کہاں یہ وقت کہ سایہ سنبھل کے چلتا ہے
 مجھے کسی بھی تعین پر اختیار نہیں
 یہ کوئی اور برے راستے بدلتا ہے
 جنوں سے رسم نہ رکھوں تو جاں سگلتی ہے
 طلب کا قرض اتاروں تو جسم جلتا ہے

ناشائس

(۱)

کہتے بھوں کی کٹاریں مری گردن پہ چلیں
کہتے الفاظ کا بیسہ مرے کانوں میں گھٹلا

جس میں اک سمت دُھند لکا تھا اور اک سمت بُجھد
اُس ترازو پہ مرے درد کا سامان سُٹلا

کم بنگا ہی نے بصیرت پہ اٹھائے نیزے
جوئے تقلید میں پیہراہن افکار دُھلا

قہقہہ ایسا تھا کہ برپا نہ ہوئی مجلسِ عشق
جس ایسا تھا کہ تحقیق کا پرچم نہ کھلا

کون سے دیں میں رہتے ہیں وہ مونسِ جن کی
روزِ اک بات سناتے تھے سنانے والے

ٹھوکروں میں ہے متلوعِ دلِ ویراں کب سے
کیا ہوئے غم کو سرِ آنکھوں پہ بٹھانے والے

رات سُنان ہے، بے نورِ ستارے مَدِ حمم
کیا ہوئے راہ میں پکوں کو بچھانے والے

آبِ توؤہِ دن بھی نہیں ہیں کمرے نام کے ساتھ
آپ کا نام بھی لیتے تھے زمانے والے

ناشائس

(۲)

اہل منزل کی مسافر پر یہ ترچھی نظریں
میزباں کی سوتے مہماں یہ نگاہ اکراہ

الْحَذَرِ خُونِ بہاتے ہوئے آدابِ کزخت
الْأَمَانِ تیر چلاتے ہوئے اخلاقِ سیاہ

یہ خط و خال سے چھنتی ہوئی نفرت کی شعاع
یہ جبینوں کی لکیروں سے اُبلتی ہوئی ڈاہ

شہر کے زلزلہ بردوش، گلی کوچوں میں
یہ کڑکتے ہوئے لہجے، یہ جگر سوز نگاہ

اُس تراژدی میں بٹھایا ہے فلک نے مجھ کو
جس میں شلتے ہیں حریفانِ تمدن کے گناہ

آدمیت کا یہ فُتدان کہ دیکھا نہ سُنّا
اجنبیت کا یہ قانُوس کہ ملتی نہیں تھاہ

نہ وہ رمِ جھم نہ وہ پُر دا، نہ وہ کوئی لبِ جُو
نُسخِ گردوں پہ دُھواں ہے، لبِ گیتی پہ کراہ

میرے ہم راز، میرے ناز اُٹھانے والے
کون سے دیں میں ہیں کوئی بتا دے اللہ

اُف یہ طوفان، یہ گرداب، یہ پھپھایو، یہ رات
کس طرف ہیں مری کشتی کے پُرانے ملا ح

تُجّد جذبات کا پھیلاؤ، الہی تو بہ
سنت الفاظ کا پتھراؤ، عیبِ ذّا باللہ

رہ و رسمِ آشنائی

زینِ نئی تھی، فلکِ ناشناس تھا جب ہم
تری گلی سے نیکل کر سوئے زمانہ چلے
نظرِ جھکا کے باندازِ مجبُر مانہ چلے

چلے بے تحیبِ دریدہ، بد امنِ صد چاک
کہ جیسے جنسِ دل و جاں گنوا کے آئے ہیں
تمامِ فسادِ سیادت لٹا کے آئے ہیں

جہاں اک عُمر کٹی تھی، اُسی قلمِ دہیں
شناخت کے لئے ہر شاہراہ نے ٹوکا
ہر اک نگاہ کے نیزے نے راستہ روکا

جہاں جلے تھے ترے حُسنِ آتشیں کے کنول
وہاں الاؤ تو کیا، راکھ کا نشاں بھی نہ تھا
چرخِ کُشمۂ مجمل دُھواں دُھواں بھی نہ تھا

مُساہرت نے پکارا نئے اُفق کی طرف
اگر دُعا کی شریعت کا یہ صلہ ہوگا
نئے اُفق سے تعارف کے بعد کیا ہوگا



بُجھ گئی شمعِ حرم، بابِ کلیسا نہ کھلا
کھل گئے زخم کے لب تیرا دیر بچہ نہ کھلا

دیر تو بے سے بگولوں کی طرح گُذرے لوگ
ابو کی طرح اُٹھ آئے جوئے خانہ کھلا

شہر در شہر پھری میرے گُتہا ہوں کی بیاض
بعض نظروں پہ مرا سوزِ حکیمانہ کھلا

نازنینوں میں رسانی کا یہ عالم تھا کبھی
لاکھ پہروں میں بھی کاشانے پہ کاشانہ کھلا

اب جو بے باک ہوئے بھی تو بہ صد اندیشہ
اب جو اک شخص کھلا بھی تو حجابانہ کھلا

بل کے بھی تجھ سے رہی اب کے طبیعت ایسے
جیسے بادل سا گھسدا آیا جو نہ برسا نہ کھلا

ہم پری زادوں میں کھیلے، شب افسوں میں پے
ہم سے بھی تیرے طلسمات کا عقد نہ کھلا

ایک اک شکل کو دیکھا ہے بڑی حیرت سے
اجنبی کون ہے اور کون شناسا نہ کھلا

ریت پر پھینک گئی عقل کی گستاخ بی
پھر کبھی کشف و کرامات کا دریا نہ کھلا

اے دورِ کورِ پرور

اَب وہ خوشی نہ وہ غم، خداں ہیں اَب نہ گریاں
کس کس کو رو چکے ہیں اے حادثاتِ دوراں

ترتیبِ زندگی نے دُنیا اُجاڑ دی ہے
اے چشمِ لا اُبالی اے گیٹوئے پریشاں

دِن رات کا تسلسل بے ربط ہو چکا ہے
اب ہم ہیں اُور خموشی یا وحشتِ غزالاں

یا دِن کو خاکِ صحرا یا شب کو دشت و دریا
یا شغلِ جام و سہبا اے جانِ مے فروشاں

ٹوٹا ہوا ہے بربطِ سُونی پڑی ہے مِصل
اے رنگ و لحن و نغمہ اے صدرِ بنمِ رنداں

پھولوں سے کھیلتا تھا، جن میں کبھی لڑکپن
کانٹے چھو رہی ہیں، سینے میں اَب وہ گھلیاں

جیسے کسی کی آہٹ، راتوں کو مقبروں میں
ہر بات ورد آگئیں، ہر راگ دہشت افشاں

یاووں کی چٹنوں سے لمے پکارتے ہیں
آسیب بن کے چھت پر اُترا ہے ماہِ تاباں

سفاک سانحوں کی روندی ہوئی قبائیں
خوں خوار حادثوں کے پھاٹے ہوئے گریباں

جیسے کوئی کہانی رُوحوں کی انجمن میں
ہر بات بے حقیقت، ہر شے طلسم افشاں

ٹیلوں کے دامنوں میں صحرائیوں کی قبریں
قبروں کے حاشیوں پر سہما ہوا چراغاں

کُن ساعتوں سے کھیلیں کُن صورتوں کو دیکھیں
جُوئے بہارِ سا کُن شہرِ نگارِ ویراں

کتنی بصیرتوں کی آنکھیں اُجھڑ چکی ہیں
اُسے دورِ کور پرورا اُسے عصرِ کم بگا ہاں

ایک شام

یوں تو لمحوں کے اس تسلسل میں
 اب سے پہلے بھی عسہ کشتی تھی
 موم بٹی کی روشنی میں نظر
 حافظے کے ورق اُلٹی تھی
 ریت کے سوگوار ٹیپوں پر
 چاندنی رات بھر بھٹکتی تھی

آج لیکن تمکے ہوئے دل پر
 جسم کا تار تار بھاری ہے
 شام کی دم بخود ہواؤں پر
 صبح کا انتظار بھاری ہے

مقبروں سے اُٹھی ہوئی آندھی
 ٹہنیوں سے اُلجھ کے چلتی ہے
 خشک پلکوں پہ آنسوؤں کی اُمید
 پے پے کر دہیں بدلتی ہے
 ایک اک عکس سانس لیتا ہے
 ایک اک یاد آنکھ نلتی ہے
 جیسے صحرا میں سر جھکائے ہوئے
 حاجیوں کی قطار چلتی ہے

زرد چنگاریوں کے دامن میں
 یوں سُلگتا ہے سرد آتش دان
 جیسے بچوں کی بھوک کے آگے
 ایک نادار باپ کا ایمان

دم بخود خامشی میں دھیرے سے
 زرد پتے قدم اٹھاتے ہیں
 یاد کے کارواں اندھیرے میں
 خواب کی طرح سرسراتے ہیں
 کھڑکیوں کے ڈرے ہوئے چہرے
 اپنی آہٹ سے کانپ جاتے ہیں

دل کی مشربان گاہ کے آگے
 ایک ٹوٹا ہوا دیا بھی نہیں
 کسی پیل کے نرم سائے میں
 کوئی پتھر کا دیوتا بھی نہیں
 روح کے کاسے گدائی کو
 چار ٹکڑوں کا آسرا بھی نہیں

لمبی چوڑی سڑک کے دامن پر
 قمتے سہے سہے چلتے ہیں
 جیسے اکشر بڑے گھرانوں میں
 فاقہ کش رشتہ دار پتے ہیں

سوچتا ہوں کہ اس دیار سے دور
 ایک ایسا بھی دیں ہے جس کی
 رات تاروں میں سج کے آئے گی
 صبح ہوگی تو گھسہ کے گوشوں میں
 تیرہی معصوم مسکراہٹ کی
 زم سی دھوپ پھیل جائے گی

تیری منسی

فلک کا ایک تقاضا تھا ابن آدم سے
سُگ سُگ کے رے اور پاک جھپک سکے
ترس رہا ہو فضا کا مہیب سناٹا
سڈول پاؤں کی پائل مگر چھنک نہ سکے
کلی کے اذن تبسم کے ساتھ شرط یہ ہے
کہ دیر تک کسی آغوش میں مہک نہ سکے

میں سوچتا ہوں کہ یہ تیری بے حجاب منسی
مزاجِ زیت سے اس درجہ مختلف کیوں ہے
یہ ایک شمع جسے صبح کا یقین نہیں
جگر کے زخمِ فروزاں سے منحرف کیوں ہے

بھرا ہوا ہے بنگا ہوں میں زندگی کے دھواں
بس ایک شعلہ شب تاب میں شریکوں ہے

مرے وجود میں جس سے کئی خراشیں ہیں
وہ ایک شکن تیرے ماتھے پہ مختصر کیوں ہے
جھی ہوئی ہے ستاروں پہ آنسوؤں کی مٹی
ترے چراغ کی نوا تنی تیسرے ترکوں ہے

نئے شوالے میں جا کر کسی کے تیشے نے
بہت سے بُت تو گرائے بہت سے بُت نہ گئے

بس ایک خندہ بے باک ہی سے کیا ہوگا
لہو کی زحمتِ اتمام بھی ضروری ہے
ذرا سی خجراتِ ادراک ہی سے کیا ہوگا

گریز و رجعت و تخریب ہی سہی لیکن
کوئی تڑپ، کوئی حسرت، کوئی مُراد تو ہے
تری ہنسی سے تو میری شکست ہی بہتر
مری شکست میں تھوڑا سا اعتماد تو ہے



اِس قدر آبِ غمِ دُور اِس کی فراوانی ہے
 تو بھی منجملہ اسبابِ پریشانی ہے
 مجھ کو اِس شہر سے کچھ دُور ٹھہر جانے دو
 میرے ہمراہ مری بے سرو سامانی ہے
 آنکھ جھک جاتی ہے جب بندِ قبا کھلتے ہیں
 تجھ میں اُٹھتے ہوئے خورشید کی عریانی ہے
 اک برا لمحہ استدار نہیں مر سکتا
 اور ہر لمحہ زمانے کی طرح فانی ہے
 کوچہٴ دوست سے آگے ہے بہت دشتِ جوں
 عشقِ دالوں نے ابھی خاک کہاں چھانی ہے
 اِس طرح ہوش گنونا بھی کوئی بات نہیں
 اُور یوں ہوش سے رہنے میں بھی نادانی ہے

طیارہ

فنائے بے کراں کی دُستوں سے بولتا ہوا
 قوی، جوان بازوؤں کے پنکھ تولتا ہوا
 عظیم ماورا کے بستروں پہ رولتا ہوا

اٹھا۔ تو بادلوں کے قافلے قدم پہ جھک گئے
 بڑھا۔ تو قوس و کمان کے پیچ و خم ٹبک گئے
 گرج کے جُست کی تو آندھیوں کے ہات رک گئے

وہ اور ہیں جو اجنبی دیار کی ہوس میں تھے
 کہ ہم اسی زمیں کی زُلفِ نارسا کے بس میں تھے
 نہیں تو، ہر دو ماہ و مشتری بھی دسترس میں تھے

ایئر ہوٹل

شہر کی روشنیاں کرمکب آوارہ ہیں
 نہ وہ ہوٹل کے درتچے نہ وہ بجلی کے ستون
 نہ وہ اطراف نہ رفتار کا گنم سکون
 ہر گھنٹی عشوہ پرواز بنی جاتی ہے

سیکڑوں فیٹ تلے ریگ رہی ہوگی زمین
 کہیں پٹرول کے مرکز، کہیں سڑکوں کا غبار
 تار کے آہنی کھمبوں میں بگھری راہ گزار
 صرف اک دور کی آواز بنی جاتی ہے

تیرے لہجے میں ہے ترغیب کی یہ کیفیت
 کہ مشینوں کی فضا ساز بنی جاتی ہے

— اے مرے دل کے دھڑکنے سے بظاہر غافل
تیری صورت تری عجازِ بنی جاتی ہے

ہم سفرِ انجمنیں گرم کئے بیٹھے ہر
تو ہر اسب سے بڑا رازِ بنی جاتی ہے

جب ہوا شب کو بدلتی ہوئی پہلو آئی
مُدتوں اپنے بدن سے تری خوشبو آئی

میرے نعمات کی تقدیر نہ پہنچے تجھ تک
میری فریاد کی قیمت کہ تجھے چھو آئی

اپنی آنکھوں سے لگاتی ہیں زمانے کے قدم
شہر کی راہ گزاروں میں ہری غو آئی

ہاں نمازوں کا اثر دیکھ لیا پچھلی رات
میں ادھر گھر سے گیا تھا کہ ادھر تو آئی

مُڑوہ اے دل کسی پہلو تو قرار آ ہی گیا
منزل دار کئی، ساعت گیسو آئی



ہم کامندوں کی مشق سخن ہائے گفتنی
اس مرحلے پہ آئی کہ اسام ہو گئی

دُنیا کی بے اُصول عداوت تو دیکھئے
ہم بُواہوس بنے تو دنا عام ہو گئی

کل رات، اُس کے آدھرے ہونٹوں میں تیرا عکس
ایسے پڑا کہ رات ترے نام ہو گئی

Last night

Betwixt her lips and mine

Thy shadow fell

The night was thine



بزم میں باعثِ تاخیر ہوا کرتے تھے
ہم کبھی تیرے غماں گیر ہوا کرتے تھے

اے کہ اب بھول گیا رنگِ حنا بھی تیرا
خط کبھی خون سے تحریر ہوا کرتے تھے

سایہٴ زلف میں ہر رات کو سو تاج محل
میرے افکاس میں تعمیر ہوا کرتے تھے

ہجر کا لطف بھی باقی نہیں اے موسمِ عقل
ان دنوں نالہٴ شبگیر ہوا کرتے تھے

ان دنوں دشتِ نوردی میں مزا آتا تھا
پاؤں میں حلقہٴ زنجیر ہوا کرتے تھے

خواب میں تجھ سے ملاقات رہا کرتی تھی
 خواب شرمندہ تعبیر ہوا کرتے تھے

وہ کہ احسان ہی احسان نظر آتا تھا
 ہم کہ تقصیر ہی تقصیر ہوا کرتے تھے



تہاں ہے سب سے مراد و بیستہ بیتاب
سوائے دیدہ بے خواب انجم و مہتاب

تھیں تو خیر مرے علم کدے سے جانا تھا
کہاں گئیں مری نیندیں کدھر گئے مرے خواب

سفینہ ڈوب گیا لیکن اس وقار کے ساتھ
کہ سر اٹھا نہ سکا پھر کہیں کوئی گرداب

عجیب بارش نیاں ہوئی ہے اب کی برس
صدف صدف شب وعدہ ہے اور گہر کم یاب

حدودِ فنی کدہ و مدرسہ گرا نہ سکے
یہ مسلمان کلیسا یہ عارفان کتاب

وہاں بھی بزمِ حسد میں ہزار پابندی
یہاں بھی محفلِ رنداں میں سیکڑوں آداب

میں تشنہِ کامِ غمِ آگہی کہاں جاؤں
ادھر شعور کا صحرا ادھر نظر کا سراب

تُو اپنے جلوۂ عریاں سے شرمسار نہ ہو
یہی تمام نظارہ یہی کمالِ حجاب

بے سمتی

گیر بدلتے ہوئے، منہ سے پھینک کر سگرٹ
ڈرائیور نے ٹریفک کو ماں کی گالی دی
کہا، حضور کہاں کیڈلک، کہاں پیسجو

کہاں حکایتِ شیریں دہان و شہدِ باں
کہ ایک سبز شکر کا نہ بل سکا پر مٹ
کہ دفاتروں کو پھلاتے ہیں تلخ گو بابو

گمانِ بن گئی تہذیبِ رستم و شہراب
حکومتوں نے بہ حق خزانہ ضبط کیے
رموزِ بکیہ ماژندران و یکخسرو

تمام دستخطی فائلوں میں ڈوب گئیں
 پری رُخانِ عجم کی نُجھکی نُجھکی پلکیں !
 ظلم ہوش رُبا کا گھنا گھنا جاؤ

کہاں مسائلِ رُوحانیت، کہاں عرفان
 مکان، رقت اسباب، کثرتِ اولاد
 شکارِ بینک، برج، ریس، غم، دوا، دارو

یہ تھوڑی دُور پہ دُکانیں فاحشاؤں کی
 لبوں پہ آخرِ شب کی بگھی ہوئی بیڑی
 بدن میں تلخیِ شہوت سے تارِ کول کی بو

شعور و بے خبری کی حدیں نہیں ملتیں
 اب اُن کو صُورِ سرافیل کیا جگائے گا
 جگا چکا جنہیں مل میں لگا ہوا بھونپو

ہر ایک شب میری محبوبہ مجھ سے ملتی ہے
 بیوں پہ بھر کٹناں میکس فیکٹر کی ہنسی
 کٹن کا حُسنِ نظر، ریولان کے ابرو

عدالتوں میں ہوا فیصلہ دل و جاں کا
 نہ وہ سُہاگ کی نو آریسے کے چہرے پر
 نہ وہ دُلہن کی نگاہوں میں حیرت آہو

جہاز اڑ گئے بمباریوں کے عزم کے ساتھ
 کہیں سے دل کی صدا آئی اس طرح جیسے
 فِلپ کے بلب کے آگے چراغ کے آنسو

نظر جھکائے ہوئے قافلے چلے آئے
 ہزار صبح بنارس نے راستہ روکا
 ہزار شامِ اودھ کے بکھر گئے گیسو

ہر ایک نیم پہ جھوٹے کی ڈوریاں لٹکیں
ہر ایک کھیت میں سرسوں کی بالیاں مہکیں
دلوں کے زخم کو لیکن نہ بھر سکی خوشبو

ادب کی ایک جماعت کا فیصلہ یہ ہے
کہ رُکنیت کی بنا پر خُزف بھی کہلائے
چراغِ لالہ و ستیاری فلک پہلو

کسے بتاؤں کہ اے میرے سوگوار وطن
کبھی کبھی تجھے تنہائیوں میں سوچا ہے
تو دل کی آنکھ نے روئے ہیں غُون کے آنسو

یہ قطرے قطرے پہ اعلانِ قُلم و حیوٰں
ذرا ذرا سی نمی پر اُمیدِ زرخیزی
یہ دشتِ بے سرو ساماں! یہ آفتابِ یہ کو

میرے وطن، میرے محبوب، تن فگار وطن
میں چاہتا ہوں تجھے تیری راہ مل جائے
میں نیویارک کا دشمن نہ ماسکو کا عدو

جلے جلانے کیسا، لٹے لٹانے حسد
طلوع ہو تو کدھر سے نئی سحر کا گجر
سکوت طوق بہ دست و صدارسن بہ گلو

شفا نصیب ہو کیسے مریضہ افکار
بڑھے تو کیسے بڑھے قافلہ خیالوں کا
ضمیر و نطق پہ پہرے قلم پہ گستاخو

تمام مشرق وسطیٰ کا ایک کلچر ہے
براک درخت میں آب حیات انگلستان
ہر ایک فصل میں واشنگٹن کا جوش نو

کہیں سے آئی صدا علم سب سے اعلیٰ ہے
 کہیں سے آئی صدا عشق سب سے برتر ہے
 کہیں سے آئی صدا لا اِلهَ اِلَّا هُوَ

رہِ نجات نہ آوارگی نہ سادہ روی
 علّٰج تیرگی میسکہ نہ عقل نہ عشق
 نہ مجذوبوں کے پیالے نہ صوفیوں کے کدو

دل و نظر کی یہ داماندگی یہ بے سمتی
 مبصر و کوئی بھڑپور فلسفہ لاؤ
 یہ چاک، سوزنِ مذہب سے بھی ہو نہ رفو

کار و بار

دماغ شل ہے، دل ایک اک آرزو کا مدفن بنا ہوا ہے
 اک ایسا مندر جو کب سے چمکا دڑوں کا مسکن بنا ہوا ہے
 نشیب میں جیسے بارشوں کا کھڑا ہوا بے کنار پانی
 بغیر مقصد کی بحث، اخلاقیات کی بے اثر کہانی
 سحر سے بے زار، رات سے بے نیاز لمحات گزریں
 نہ فکر فردا، نہ حال و ماضی، نہ صبحِ خنداں نہ شامِ گریاں

پھارتا ہے کوئی تو کہتا ہوں اس کو سُن کر بھی کیا کرو گے
 ادھر گُذر کر بھی کیا ملے گا، اُدھر نہ جا کر بھی کیا کرو گے
 شفقِ نظر کا فریب ہے تبتلیوں کی رنگت میں کونچہ نہیں
 فراق میں کیا غلسم ہو گا جب اُس کی قُربت میں کونچہ نہیں
 لہو کی گرمی ہے کم سنی کی دلیل، اُس سے نجات پاؤ
 یہ نظم بحال پا کے بھی کیا کرے گی۔ دفتر کے کیس لاؤ



ساری مَحلِ طُفّ بِیاں پر جُوم رہی ہے
 دِل میں ہے جو شہرِ خوشاں کس سے کہئے

ساعتِ گل کے دیکھنے والے آئے ہوئے ہیں
 شبنم تیرا گریہ نہ پاں کس سے کہئے

شام سے زخموں کی دُکانِ سبائی ہوئی ہے
 اپنا یہ اندازِ چراغاں کس سے کہئے

اُوجِ فضا پر تیز ہوا کا دم گھٹتا ہے
 وسعت و وسعتِ مَکّی زنداں کس سے کہئے

بازار

وہی ذمہ دارانِ ناموس اُمت وہی حامیانِ حرمِ پاک تھے ہیں
جو لوح و قلم کی حفاظت کو نکلے تھے ثودان کے لوح و قلمِ پاک تھے ہیں

خطیبانِ بزمِ صفائے گئے ہیں عرفیانِ بیتِ التَّحَنُّمِ پاک تھے ہیں
کچھ آدرشِ خندہ بہ لب مر گئے ہیں کچھ انکارِ جہنمِ غمِ پاک تھے ہیں

اُصولوں کی مطلوبیت کون دیکھے، کہے اس کی جرات کہ اس کو بلا میں
اماموں کا ٹھوں در بہ در بہرِ بچکا ہے دُصولوں کے نقشِ قدمِ پاک تھے ہیں

بڑے فخر سے بیچ مٹی میں نیلام کر دی گئی عصمتِ حرفِ وحکت
بڑے ناز سے چوک میں دستِ ذہنِ امیرانِ سیف و قلمِ پاک تھے ہیں

بخشیانِ نعم و دارِ حق کوشِ بکھے میں سطوت کی چو کھٹ پہ سجدے کی خاطر
ادیبانِ والا تبار و زریسانِ شہرِ با و ضنمِ پاک تھے ہیں

براکِ نعمہ فریاد میں دُسل گیا ہے ہر آواز دار و رسنِ چسکی ہے
یہاں زندگی مکر و فن بن چکی ہے خلوصِ دُراج و حشمِ پاک تھے ہیں

یہاں ایک آنسو کی پوچھ ہے کس کو، یہاں مرگ انبوہ کا جشن ہو گا
یہاں ایک رستے کے مٹنے کا کیا غم، ہر اک راہ کے پیچ و غم، پک چکے ہیں
میری ایک مسجد ہے اب تک و فزائل سو کب تک کہ بجھنے کو ہے شمع ایماں
میرا ایک جامِ سفالیں بچا ہے سو کیا ہے کہ سب جامِ جم پک چکے ہیں

رشتہ جامِ دُستو

جانے کب ابر سے نکلے میرا کھویا ہوا چاند
جانے کب محاسنِ ارباب و قاروشن ہو
راستے نورِ طلب، شامِ سفرِ عکس ہی عکس
ڈوبتے، کانپتے سہمے ہوئے، بجھتے ہوئے دل
درد کا بوجھ اٹھائے ہوئے، گجرائے ہوئے
صبح کے کفشِ زدہ، رات کے ٹھکرائے ہوئے

جانے کب حلقہ گرداب سے ابھرے ساحل
سرچکتی ہوئی موجوں کا تلاطم کم ہو
جانے کب گوئی بجتی لہروں کی صدا مدھم ہو
کھٹ اُگلتا ہو اُطوفان، پُر اسرار ہوا
غیر محفوظ خلاؤں میں زمیں کا بن باس
نہ قضا، نہ طقت پہ مائل نہ فلک در دشناس

• دلی میں نہ جانے کوڑھست بکھا جاتا ہے کیسٹوا ورائے باوریں جابائے کا

• یہ نظم عبدالغنی خان اور پاکستان کی منتسبہ جنگ کے دوران لکھی گئی

کر دیئے ترکِ قہسیلوں نے جنوں کے رشتے
 زخمِ کس طرح بھریں، چاکِ ہسگر کیسے بھریں
 سرخدیں آگ کا میدانِ بنی بیٹھی ہیں
 اے غزالا ان چمنِ آب کے بھریں یا نہ بھریں

بل کے بیٹھیں بھی تو جانے کوئی کیا بات کہے
 رشتہٴ جامِ دسبُو یاد رہے یا نہ رہے

ایک گننام سپاہی کی قبر پر

تیری محراب پہ آئے عصہ کھن کی تاریخ
 صرف گوتم کے جسیں بُت کا بتسم کیوں ہے
 کس لئے کیل سے لگی ہے فقط ایک صلیب
 ایک زنجیر کے حلقے کا ترنم کیوں ہے
 اک ارسطو سے ہے کیوں گوشہ دانش پر نور
 ایک سقراط کے سینے کا تلاطم کیوں ہے

اسی محراب کے سائے میں کئی ابنِ علی
 کئی خونخوار یزیدوں سے رہے گرم ستیز
 تیرے مسلک میں ہوئی نام و نسب کی توقیر
 تیرا ہیرو کوئی خسرو ہے تو کوئی پرویز
 تو نے اقوام کے انبوہ میں وہ لوگ چنے
 جن میں سے کوئی جہانگیر ہے کوئی چنگیز

تجھ سے ممکن ہو تو اُسے ناقدِ آیام کہن !
 اپنے گنہگارِ حُزنانوں کو اٹھا کر رکھ لے
 رات بے نام شہیدوں کے لئے روتی ہے
 ان شہیدوں کا لہوِ دل سے لگا کر رکھ لے
 ماؤں کے میلے دوپٹوں میں ہیں جو آتسو جذب
 اُن کو آنکھوں کے چراغوں میں سجا کر رکھ لے

ہو گئے راکھ جو پر چُن اُنہیں خاکِ تر سے
 سُرخِ جُراست پروانہ بنے یا نہ بنے
 عام شکلوں میں بھی ہے عارضِ سلمیٰ کا جمال
 ان کو بھی دیکھ، ہنسِ خاند بنے یا نہ بنے
 زینت کے جوہرِ نایاب کی تشریف تو کر
 اس کی تشریف سے افسانہ بنے یا نہ بنے

ایک نوحہ

[۳۴ اکتوبر ۶۴ء کو بسین اور سینٹامریا کے درمیان ہوائی حادثے میں جہاں بحق ہونے والے مرحوم دوست شیخ جاوید احمد کی موت پر]

ایک تار یک ستارہ ہے اُفق پر غلطاں
اک الم ناک خموشی ہے پس پردہ ساز

یہ اندھیرے میں کسے شوق پذیرائی ہے
یہ خلاؤں میں کسے ڈھونڈ رہی ہے آواز

مرہم لطف و وفا تجھ کو کہاں آئے زخم
ہم سفر تجھ کو کہاں لے گئی تیسری پرواز

زندگی نغمہ و آبنگ تھی تیرے دم سے
موت نے چھین لیا کیسے ترے ہات سے ساز

کبن چٹانوں سے کروں سنگِ دلی کا شکوہ
اے فضاؤں کے سخنِ فہم، صبا کے ہمسرا

اگ کس طرح ترے جسم کے نزدیک آئی
کیسے پٹرول کے شعلوں سے دبا شعلہ ساز

کون سے دشت میں لی آخری بچکی تُو نے
کس دھماکے سے نگوں ہو گئی تیری آواز

کیوں دُعائیں نہ بنیں تیری نگہاں اُس وقت
کیوں نہ کام آئی مرے چاکِ گریباں کی نماز

میرے محبوب گھمے مل کے پٹ کر مل جا
میرے بھائی ترے بننے کے ہزاروں انداز

آواز کے سائے

خبر نہیں تم کہاں ہو یارو

ہماری اُفتادِ روز و شب کی
 تمہیں خبر مل سکی، کہ تم بھی
 رہیں دستِ حنراں ہو یارو
 دنوں میں تفریقِ مٹ چکی ہے
 کہ دقت سے خوش گماں ہو یارو
 ابھی لڑکپن کے حوصلے ہیں
 کہ بے سرو سائبان ہو یارو

ہماری اُفتادِ روز و شب میں
 نہ جانے کتنی ہی بار اب تک
 دھنک بنی اور بکھر چکی ہے
 عروسِ شب اپنی خلوتوں سے
 حسد کو محروم کر چکی ہے

دیکھتے صحرائیں دُھوپ کھا کر
 شفق کی رنگت اتر چکی ہے
 بہار کا تعذیب اٹھائے
 نگارِ یک شب گُذر چکی ہے

اُمیدِ نوروز ہے کہ تُم بھی
 بہار کے نوحہ خواں ہو یا رو

تُھاری یادوں کے قافلے کا
 تھکا ہوا حبیبی مُسامرہ
 ہر اک کو آواز دے رہا ہے
 خفا ہو یا بے زباں ہو یا رو

یہ آدمی کی گزرگاہ

زندگی آج تو کس طرف آگئی

صبح کی سپید روشنی چھوڑ کر
 مدھنبری شام کی کم رسی چھوڑ کر
 اوس پیتی بُئی چاندنی چھوڑ کر
 اُس کے نمکڑے کی میٹھی نمی چھوڑ کر

زندگی آج تو کس طرف آگئی

اس نئے دیس کے اجنبی راستے
 کتنے تاریک، کتنے پُر اسرار ہیں
 آج تو جیسے وحشی قبیلے یہاں
 اک نئے آدمی کے لہو کے لیے
 جسم پر راکھ نل کر نکل آئے ہیں

آنکھ میں چُج رہا ہے کیلا دُھواں
جسم کو چُھو رہی ہیں ٹھنک سُونیاں
ہر قدم پر ڈچھر، ہر طرف ہڈیاں

وقت کی غوف سے سانس رکتی ہوئی
رات کے بوجھ سے ہانپتی خاموشی
ہر طرف تیسہ گی تیسہ گی تیسہ گی

پیڑ کے رُوپ میں کوئی دُشمن نہ ہو
پائس کے موڑ پر کوئی رہزن نہ ہو
یہ کھنڈر کوئی رُوحوں کا مسکن نہ ہو

اِس بھٹکتی صدا میں کوئی راز ہے
یہ پُرانا دیا کس کا غمناک ہے؟
کس کی آہٹ ہے یہ کس کی آواز ہے؟

کس لیے آج سامانِ شبنون ہیں؟
 کون سے رازِ سینوں میں مدفون ہیں؟
 کس کے لشکرِ ابِ آمادہٴ خون ہیں؟

ہر طرف دُھند ہے ہر طرف سہم ہے
 کوئی صاحبِ نظر ہے کہ ناہنسہم ہے؟
 سانپ کی سرسراہٹ ہے یا دہم ہے؟

زندگی آج تو کس طرف آگئی

میں تری راہ کس طرح روشن کروں
 میری ویران آنکھوں میں آنسو نہیں
 تیرے سازوں کی تحریک کے واسطے
 میرے ہونٹوں پہ گیتوں کا جادو نہیں
 راتِ مُندان ہے راہِ ویران ہے
 کوئی نغمہ نہیں کوئی خوشبو نہیں

آج تک میں نے تیرے لیے رات دن
 موتیوں اور چراغوں کے ہر ہمتاں پر
 کتنے گہرے عقیقت سے حاضر کیے
 کنواریوں کے بدن کی جواں اوس سے
 تیرے پھولوں کے چہروں کو ضو بخش دی
 جب بجھی جا رہی تھی تری دل کشی
 تیرا منہ چوم کر تجھ کو نو بخش دی

پوڑیوں کی کھنک سے ترے واسطے
 ایسے معصوم نغمے مرتب کیے
 جن کو سن کر ستاروں کے اک شہر میں
 کرشن کے ہات سے بانسری چھٹ گئی

تیری ہر سبب کو، تیرے ہر خواب کو
 میں نے پریوں کی زلفوں کا بستر دیا
 نو عروسوں کی شراب میں سونپ دیں
 لئے کے گھنے، تبسم کا زیور دیا
 اپسراؤں کے سینوں کے بھونچال سے
 جذبتیں چھین کر تجھ کو پسکر دیا
 تیرے بالوں پہ غزلوں سے آفتاب چنی
 تیرے ماتھے کو نقطہوں کا جھومر دیا
 انگلیوں کو اجنتا کی صنعت گری
 انکھڑیوں کو بنارس کا منظر دیا

ایک تشبیہ سوچی کمر کے لیے
 استعارے تراشے نظر کے لیے
 جسم اور خون سے ماورا کہہ دیا
 اور اک روز تجھ کو خدا کہہ دیا

زندگی آج تو کس طرف آگئی

میں چٹانوں سے منہ باد بن کر لڑا
 تو نے تیشے میں میسرا لہو بھر دیا
 وایک اور بدھ بن کے آواز دی
 تو نے صحراؤں میں مجھ کو گم کر دیا
 ٹرائے کی جنگ میں تیرا بومر بنا
 مجھ سے آنکھوں کی سب نعمتیں چھین گئیں
 دشتِ احساں میں تیرا شاعر بنا
 تیرے کانٹوں نے میری رگیں چھیل دیں
 میں نے دھونڈا مجھے ذہنِ سفاک میں
 اور مجھے زہر کا جام پینا پڑا
 میں نے بانا تجھے بے حد و بے مکان
 اور مجھے قید خانوں میں جینا پڑا

.. I fall upon the thorns of life

I bleed

— Shelley

حادثوں نے بٹھا دی حقیقت کی نو
 تجربوں نے عمتِ اند کو گم کر دیا
 پھر بھی میں تیرے دامن کو تھامے ہوئے
 زخم دھوتا رہا اور گاتا رہا
 اور مہکے یہ زخموں کا بن یا نہیں
 اور کچھ دن رہے یہ لگن یا نہیں
 اے مری ہم سفر مجھ کو آواز دے
 مسکرائے گی کوئی کرن یا نہیں
 جس کھنڈر پر گھنی موت کا راج ہے
 اُس سے ابھرے گی صُبحِ وطن یا نہیں
 اقتصادی خیالات کی جنگ میں
 جیت جائے گا شاعر کا فن یا نہیں

گانے والیاں

اُس کے سازِ ندوں کی آنکھوں میں نہ دُرِ گانہ طہار
صرف یہ فکر کہ بے خواب رہیں گے کب تک
اپنے بے نامِ ممتدّر کو سہیں گے کب تک

جاگتے ہونٹ، پچکتے ہوئے عارض کا بھڑار
شکراتے ہوئے یوں شک نہیں گے کب تک
یہ دیکتے ہوئے رُخسار رہیں گے کب تک

گاؤ تیکھے سے پلٹتے ہوئے دو بچوں نے
اپنی ماؤں کو، کبھی رقصِ جنوں کو دیکھا
سازِ ویراں کو، کبھی سوزِ دروں کو دیکھا

لوریاں دے کے سُلائیں گی یہ مائیں کہ نہیں
چوم کر صُبح اُٹھائیں گی یہ مائیں کہ نہیں
جاگ کر ہم کو سُلائیں گی یہ مائیں کہ نہیں

دیوانوں پہ کیا گزری

صرف دو چار برس قبل تو نہیں بر سرِ راہ
 بن گیا ہوتا اگر کوئی اسٹار اہم کو
 کسی خاموش تکلم کا سہارا اہم کو
 یہی دُزدیدہ تبسم، یہی چہرے کی پکار
 یہی وعدہ، یہی ایما، یہی مبہم استدرا

ہم اسے عرش کی سرحد سے ملانے چلتے
 پھول کہتے کبھی سنگیت بنانے چلتے
 غافلت ہوں کی طرف دیپ جلانے چلتے

مِرت دو چار برس قبل! مگر اب یہ ہے
 کہ تری نرم نگاہی کا اشارہ پا کر
 کبھی پستر کبھی کمرے کا خیال آتا ہے

زندگی جسم کی خواہش کے سوا کچھ بھی نہیں
 خون میں خون کی گردش کے سوا کچھ بھی نہیں

گناہ گار

اے سوگوار یاد بھی ہے تجسّر کو یا نہیں
وہ رات جب حیات کی زلفیں دراز تھیں
جب روشنی کے نرم کنول تھے نیچے نیچے
جب ساعتِ ابد کی توں نیم باز تھیں
جب ساری زندگی کی عبادت گزریاں
تیری گناہ گار نظر کا جواز تھیں

اک ڈوبتے ہوئے نے کسی کو بچا لیا
اک تیرہ زندگی نے کسی کو نگاہ دی
ہر لمحہ اپنی آگ میں جسنے کے باوجود
ہر لمحہ زہرِ حشرِ جنت کو راہ دی
ہم نے تو تجھ سے دُور کی ہمدردیاں دکھائیں
تو نے کسی سے رسمِ وفا بھی نباہ دی

فسار

اس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے

رقصِ تھم جائے، اداؤں کے خزانے ٹٹ جائیں
 وقت کا درد، نگاہوں کی تھکن، ذہن کا بوجھ
 نغمہ و ساغر و اہام کا رُتبہ پالے
 کوئیلیں دُھوپ سے اک قطرہ شبنم مانگیں
 سنگساری کا سزاوار ہو بلور کا جسم
 دل کے اُبھڑے ہوئے مندریں وفا کی مشعل
 مصلحت کیشی طوفان کی زد میں آجائے
 آہوئے دشتِ جنوں شہر کی حد میں آجائے

سب کے قدموں میں تننا پئے خمیازہ گرے

عاقلو، ویدہ ورو، دُوسری راہیں ڈھونڈو
 اس سے پہلے کہ خرابات کا دروازہ گرے

مَدِّتوں کو رہنمائی دل کی
 نورِ عرفاں کو ترستی رہتی
 توجہ خورشید نہ بن کر آتی
 ذہن پر اوس پرستی رہتی

کیا خبر آج تیری پلکوں میں
 یز بھی ہے کہ عنم کا سوز و گداز
 میرے سینے سے اب بھی آتی ہے
 تیری پلکوں کی رسمِ دل آواز

اللہ اللہ یہ لرزشیں ہر گاہ
 بچھپنے کا ہے طرہ راز و نیاز
 راکنی میں ڈھلا ہوا گویا
 رات کو گھومتے کڑے کا گداز

مجھ کو چپ چاپ اس طرح مت دیکھ
 میرے بستر کی سلوٹیں مت کھول
 رات میں کتنی دیر سویا ہوں
 بول اے صبح کے ہستارے بول

اُس کو کِرنوں نے دی ہے تا بانی
 اُس کو ہتّاب نے سنوارا ہے
 یوں وہ عورت ضرور ہے لیکن
 اُس کی بُنسیادِ استعارا ہے

یوں تو اکشر خیال آتا ہمت
 میں جو ہوں اُس سے ماسوا بن جاؤں
 تیری آنکھوں کو دیکھنے کے بعد
 میں نے چاہا کہ میں خُدا بن جاؤں

مُن کے لوگوں کے زہر سے فقیرے
 دیکھ کر اپنے گھس کی بربادی
 میں بھی جب مُسکرا ہی لیتا ہوں
 تم تو کِتنا بدل گئی ہو گی



صرف کہہ دوں کہ ناؤ ڈوب گئی
یا بتاؤں کہ کیسے ڈوبی تھی
تم کہانی تو خیر سن لو گی
آپ بیٹی کہوں کہ جاگ بیٹی

کوئی سامندر کی سمت گرم فرار
کوئی جسموں میں ڈھونڈتا ہے سکوں
مجھ کو بھی بل گئی ہے جائے پناہ
شعر لکھتا ہوں اور جیتا ہوں

وقت کے ساتھ لوگ کہتے تھے
زخمِ دل بھی تمھارے ہوں گے دور
رفتہ رفتہ یہ وقت آپہنچا
میرا ہر زخم بن گیا ناسور

محبت

تُو میری شمعِ دل و دیدہ، میری معصومہ
 پیار کی دھوپ میں نکلی تو پگھل جائے گی
 کھوٹا، گونجتا لاوا ہے میرے جسم کا لمس
 تُو میرے ہونٹوں کو چھوے گی تو جل جائے گی

تستِ بیاں چُن ابھی خاروں کی طلبگار نہ بن
 لوریاں سیکھ میرے درد میں غمِ خوار نہ بن
 ہزیم آہنگ میں آ، نالہِ خوشبار نہ بن

میرا دلِ وقت کے طوفان میں ہے ایسی چٹان
 کہ سفینہ اُدھر آیا تو بکھر جائے گا
 ابدی نیند کا پعینم ہے میرا آغوش
 جو میری گود میں آئے گا وہ مر جائے گا

خزانہ

رات کے خواب جلے دن کی تمازت سے مگر
تو مریے واسطے فردوس گماں آج بھی ہے

وہی ہر سمت ترے نام کی دیواریں ہیں
وہی آفاق کی مسدود عناں آج بھی ہے

وہی تابندہ درخشاں ہے ترے رُوپ کی نو
وہی حالات کا سیلاب رواں آج بھی ہے

سیکڑوں جسموں سے کھیلی ہے جوانی میری
دل میں تقدیس و طہارت کا سماں آج بھی ہے

دوسرے بُت کدے روشن بھی ہوئے بُجھ بھی گئے
تیری مسجد میں وہی سوزِ اذال آج بھی ہے

اُن گناہوں میں بجلا ہوں کہ مرے سینے میں
خوشبوئے محبتِ مریم بڈناں آج بھی ہے

غم تو مے خانے کی تاریک گلی تک لایا
ذہن میں سلسلہ کا بکشاں آج بھی ہے

کوہساروں کی طرح سارکت دے جان ہے وقت
آبشاروں کی طرح طبع رواں آج بھی ہے

تنگی دائرۂ اہل حسد کے باد صفت
وسعت حلقۂ آشفۃ سراں آج بھی ہے

ساری سڑکوں پہ اجبارہ ہے مہنہ مندوں کا
موڑ پر عشق کی چھوٹی سی دُکّاں آج بھی ہے

اندھیاں تیز ہیں اور طاقِ ایشیائی میں
اک چرخِ تہہ و اماں کا دھواں آج بھی ہے

اب کہاں قافلہ کا کل و رُخسار مگر
دیدہ شوق بہر سو نگراں آج بھی ہے

• کبھی الف ہے، اُردو میں عام طور پر الف پڑھتے ہیں

اُجھکیں ٹوٹ رہی ہیں تجھے چھوٹنے کے لئے
بے حس باتوں کا ٹھٹھکاؤں آج بھی ہے

کشتہ تیشہ لپی ہوں، مگر ان ہونٹوں میں
بُوئے شاداب مسیحا نفساں آج بھی ہے

آب نہ تپتی ہوئی باتیں نہ ٹھٹھکتے ہوئے خط
گرم آتش کدہ حرف و بیاں آج بھی ہے

ایک اک زخم پہ محفوظ ہیں تیروں کے نگار
مسکراتی ہوئی ابرو کی کماں آج بھی ہے

بازوؤں میں تری آہو بدنی باقی ہے
کروٹوں میں تری وحشت کا نشان آج بھی ہے

آج کل کون دُعا دار ہوا کرتا ہے
خود پہ نمازاں ہوں کہ یہ جنس گراں آج بھی ہے

ہارِ جیت

میری بن جانے پہ آمادہ ہے وہ جانِ حیات
جو کسی اور سے پیمانِ وفا رکھتی ہے
میرے آغوش میں آنے کے لئے راضی ہے
جو کسی اور کو سینے میں چھپا رکھتی ہے

شاعری ہی نہیں کچھ باعثِ عزت مجھ کو
اور بہت کچھ خُند و رشک کے اسباب میں ہے
مجھ کو حاصل ہے وہ معیارِ شب و روز کہ جو
اُس کے محبوب کے ہاتوں میں نہیں خواب میں ہے

کون جیتے گا یہ بازی مجھے معلوم نہیں
زندگی میں مجھے کیا اور اُسے کیا مل جائے
کاش وہ زینتِ آغوش کسی کی بن جائے
اور مجھے گرمیِ پیمانِ وفا مل جائے

فسادِ ذات

دریدہ پیسہ ہنی کل بھی تھی اور آج بھی ہے
 مگر وہ اور سبب تھا — یہ اور قصہ ہے
 یہ رات اور ہے، وہ رات اور تھی، جس میں
 ہر ایک اشک میں سارنگیاں سی بجتی تھیں
 عجیب لذتِ نظارہ تھی حجاب کے ساتھ
 ہر ایک زخم ہسکتا تھا ماہتاب کے ساتھ
 یہی حیاتِ گریزاں بڑی سُہانی تھی
 نہ تم سے رنج نہ اپنے سے بدگمانی تھی

شکایت آج بھی تم سے نہیں کہ محمد مومی
 تمہارے در سے نہ ملتی تو گھر سے بل جاتی

تمہارا عہد اگر اُستوار ہی ہوتا
 تو پھر بھی دامنِ دل تار تار ہی ہوتا
 خود اپنی ذات ہی ناخنِ خود اپنی ذات ہی زخم
 خود اپنا دل رگِ جاں اور خود اپنا دل نشتر
 فسادِ خلق بھی خود اور فسادِ ذات بھی خود
 سفر کا وقت بھی خود جنگلوں کی رات بھی خود

تمہاری سنگِ دلی سے خفا نہیں ہوتے
 کہ ہم سے اپنے ہی وعدے وفا نہیں ہوتے

اسی گھر میں

بیٹھا ہوں سیہ بخت و مگدر اسی گھر میں
اتراخت مرا ماہِ مُنَوَّر اسی گھر میں

آئے سانس کی خوشبو لب و عارض کے پسینے
کھولا تھا برے دوست نے بستر اسی گھر میں

چمکی تھیں اسی صحن میں اُس ہونٹ کی کلیاں
بہکے تھے وہ اوقات بستر اسی گھر میں

افسانہ در افسانہ تھا مڑتا ہوا زینہ
اسحیہ در آئینہ تھا ہر در اسی گھر میں

ہوتی تھی حریمِ ناز بھی ہر بات پر اک بات
رہتی تھی قیساں بھی اکثر اسی گھر میں

شرمندہ ہوا تھا یہیں پسندِ امارت
چمکا تھا فقیہوں کا مُتِ اِسی گھر میں

سوئی تھی یہیں تھک کے بلائے شبِ ہجراں
جاگی تھی کوئی زُلفِ مُعْثِرِ اِسی گھر میں

اک زَمَزمہ رفتار کے قدموں کی بدولت
چمکا تھا کبھی چشمہ کوثرِ اِسی گھر میں

وہ جس کے درِ ناز پہ ٹھکتا ہے دو عالم
آئی تھی بڑی دُور سے چل کر اِسی گھر میں

وہ اجنبی

وہ مہر و ماہ و مشتری کا ہم سفر کہاں گیا
وہ اجنبی کہ تھا مکان و لامکان کہاں گیا
تس رہا ہے دل کسی کی داؤری کے واسطے
پیمبرانِ نیم جاں حُدا ئے جاں کہاں گیا
وہ مُلقّت بہ خندہ ہائے غیر کس طرف ہے آج
وہ بے نیاز گریہ ہائے دوستاں کہاں گیا
وہ ابر و برق و باد کا جلیس ہے کدھر نہاں
وہ عرش و فرش و ماورا کارازواں کہاں گیا
وہ میزباں کہاں ہے جس کی دید بھی محال تھی
جو آج تک نہ آسکا وہ مہی سماں کہاں گیا
بجھی پڑی ہے ماہتاب و کہکشاں کی انجمن
وہ صدرِ بزمِ ماہتاب و کہکشاں کہاں گیا

یہ کائناتِ آب و گل ہے جس کے غم میں مضمحل
 دیا ہے جس نے سوزِ دل وہ مہرِیاں کہاں گیا
 ترس رہے ہیں دورِ دور تک اُداس راستے
 مسافرِ دلت و سیرِ کارِ واں کہاں گیا

اعتراف

ترے کرم نے مجھے کر بیاستبول مگر
مرے جسٹوں سے محبت کا حق ادا نہ ہوا

ترے غموں نے مرے ہر نشاط کو سمجھا
میرا نشاط ترے غم سے آشنا نہ ہوا

کہاں کہاں نہ مرے پاؤں لڑکھڑائے مگر
ترا ثبات عجب تھا کہ حادثہ نہ ہوا

ہزار دشمنہ و خبیثہ تھے میرے لہجے میں
تری زباں پہ کبھی حرفِ ناروا نہ ہوا

ترا کرم جو گھٹا بھی تو بے پناہ رہا
میرا سلوک بڑھیا بھی تو منصف نہ ہوا

ترے دکھوں نے پکارا تو میں قریب نہ تھا
 مرے غموں نے صدا دی تو فاصلہ نہ ہوا

ترے مجاز میں اس کے لئے پرستش تھی
 خدا کا نام لئے جس کو اک زمانہ ہوا

ہزار شمعوں کا بنتا رہا میں پروانہ
 کسی کا گھر، تیرے دل میں، مرے سوانہ ہوا

مری سیاہی دامن کو دیکھنے پر بھی
 ترے سفید دوپٹوں کا دل بُرا نہ ہوا

خُزَن کی جیب میں کیا تھا سوائے گُناہی
 بس ایک گوہرِ نایاب سے خزانہ ہوا

توہری شمعِ دل و دیدہ

وہ کوئی رقص کا انداز ہو یا گیت کی تمان
میرے دل میں تری آواز اُبھر آتی ہے
تیرے ہی بال کچھ جاتے ہیں دیواروں پر
تیری ہی شکل کت بوں میں نظر آتی ہے

شہر ہے یا کسی عیتِ رکا پڑ ہولِ طلسم
تو ہے یا شہرِ طلسمات کی نصیحتی سی پی
ہر طرف سیلِ رواں، بس کا دھواں، ریل کا شور
ہر طرف تیسرا ٹخنک گام، تری جلوہ گری

ایک اک رگ تری آہٹ کے لئے چشمِ براہ
جیسے تو آئے گی بس کوئی گھڑی جاتی ہے
تیری پر چھائیں ہے یا تو ہے مرے کمرے میں
بلب کی تیسرے چمک ماند پڑی جاتی ہے

ٹینک سڑکوں پہ چلیں جیپ کے آگے پیچھے
 دن گزرتا ہے ترا سایہ ابرو لے کر
 فلسفے مند حقائق کی شعاعیں ڈالیں
 شام آتی ہے تری آنکھ کا جادو لے کر
 میں اسی گیس کی دنیا میں تعفن کے قریب
 شعر لکھتا ہوں ترے جسم کی خوشبو لے کر

نذرِ حنا

نغمہ و رنگِ مرے حلقہٴ ماتم میں نہ آ
 صبحِ فردوسِ مری شامِ جہنم میں نہ آ
 میرے سینے میں گناہوں کی فراوانی ہے
 دشت کی دُھوپ ہے، طوفان کی طُغیانی ہے
 خارِ بے مایہ کی تنکیم بڑھادی میں نے
 لذتِ زخم کو ہر بار دُعا دی میں نے
 آگ کے واسطے کوثر کا سبُو توڑ دیا
 رشتہٴ دامنِ جبریلِ امیں چھوڑ دیا
 اپنا گھر بچونک دیا قادیان کے لئے
 دل لہو کر لیا ہر رنگ کے پمیاں کے لئے
 مشقِ ماتم کے لئے زمزمہ خوانی کھو دی
 دشت کے واسطے دریا کی روانی کھو دی
 چاکِ پیراہنِ دل چاک رہا اور نہ سیا
 عقل کو دائۂ گندم کے عوض بیچ دیا

چھوڑ کر اپنا بھرم ملتِ اسلامی میں
 رات بھر جشن کیا کو چہ بدنامی میں
 نہ دُعائیں نہ حکایاتِ ذوالاکرام رہیں
 لب و زُخار کی گلیاں سحر و شام رہیں

پھر نہ اس مصیبتِ دل میں جلا شمعِ ظہور
 میری انجیلِ تمنا میری تفسیرِ زُبور
 پھر نہ وہ دردِ اُٹھا جو غمِ ادراک میں ہے
 پھر نہ اُس چوٹ کو اُگسا جو رگِ خاک میں ہے
 تو جو آتی ہے اندھیرے میں شبستاں بن کر
 دیر تک زحمت لہکتے ہیں بہاراں بن کر
 مُنہ سے کچھ بھی نہیں کہتی ہیں نگاہیں تیری
 برچھیاں بن کے اتر جاتی ہیں آہیں تیری
 ایک اک ٹون کا قطرہ نگراں ہوتا ہے
 ایک اک لمحہ ملامت کی زباں ہوتا ہے

ٹوٹ جا، رُوح وفا، جسم نہ پالے تجھ کو
 میرے جگل کی گھنی رات نہ آ لے تجھ کو
 کہیں تو بھی نہ مرے ساتھ فنا ہو جائے
 یہ لہو بھی نہ کہیں نذرِ حسا ہو جائے

ایک عصرانہ

جانِ مہربان، ترا اندازِ سخن جو کچھ ہو
 تیری آفتاد، ترے دل کی لگن جو کچھ ہو
 تجھ کو آتا ہو ستاروں سے کسنا یہ کرنا
 تو نے سیکھا ہو خداؤں کو رعایا کرنا
 لفظ کی اوٹ میں کھلتے ہوں معانی کیا کیا
 بات بنتی ہو اشاروں کی زبانی کیا کیا

آج تو مایہ علیہ لب و لہجہ امکان
 جب تری جنبشِ ابرو سے نہ چکیں کلیاں
 تو نے تسخیر و تعلق کے لئے کیا نہ کیا
 اُس نے اظہار تو کیا، وہم تمنا نہ کیا
 اے کہ تو شمعِ سرطور ہے کاشانوں میں
 نام بھی اُس نے نہ پوچھا ترا مہمانوں میں

سہرا

یارو شہید رسم جنا ہم ہوئے کہ تم
 اپنی سلامتی سے خفا ہم ہوئے کہ تم
 ہم پر ہنسنے کا جو بھی نغنے گا یہ واردات
 رسوا سرسوم و صبا ہم ہوئے کہ تم
 مانا کہ وہ ہمارے مفتدر سے دور ہے
 اُس کے لئے دُعا ہی دُعا ہم ہوئے کہ تم
 مانا کہ ہم پہ اُس کی محبت حرام ہے
 چُپ چاپ کُشتگان وفا ہم ہوئے کہ تم
 ہم اُس ہوا کو چوم رہے ہیں جہاں وہ تھی
 بیعت کُنن دست ضیا ہم ہوئے کہ تم
 مشرق کے ہر رواج کی شہ بان گاہ پر
 ہسرا ہیماں صد شہدا ہم ہوئے کہ تم
 جس کی خموشیوں میں حکایت کا سوز تھا
 اُس کی ٹھکایتوں کی بنا ہم ہوئے کہ تم

ہے اُس کے چشم و رُخ کی ضیا غیر کے لئے
 ہاں اُس کے چشم و رُخ کی حیا ہم ہوئے کہ تم
 اُن آنکھڑیوں میں شرم کے ڈولے کہاں سے آئے
 اُن آنکھوں پہ رنگِ حنا ہم ہوئے کہ تم
 لکھا ہو بل کے سارے ستاروں نے جس کا نام
 اُس کہکشاں پہ آبلہ پا ہم ہوئے کہ تم
 اِس عقل و ہنس و عمر و فراست کے باوجود
 ذہنِ رقیب و دستِ گدا ہم ہوئے کہ تم

ہم لوگ

اُو اُس یاد کو سینے سے لگا کر سو جائیں
اُو سوچیں کہ بس اک ہم ہی نہیں تیرہ نصیب
اپنے ایسے کئی آشفۃِ جگر اور بھی ہیں

ایک بے نام تھکن، ایک پُر اسرار کنک
دل پہ وہ بوجھ کہ بٹولے سے بھی پُوچھے جو کوئی
انگلہ سے جلتی بُوئی رُوح کا لاوا بہہ جائے

چارہ سازی کے ہر انداز کا گہرا نشتر
غم گری کی روایات میں اُجھے ہوئے زخم
دردِ مندی کی خراشیں جو مٹائے نہ رُمیں

اپنے ایسے کئی اشفۂ چگر اور بھی ہیں
 لیکن آئے وقت وہ صاحبِ نظراں کیسے ہیں
 کوئی اُس دیس کا بل جائے تو اتنا پوچھیں
 آج کل اپنے میسِ نفساں کیسے ہیں
 آندھیاں تو یہ سُنا ہے کہ اُدھر بھی آئیں
 کونپلیں کیسی ہیں، شیشوں کے ہکاں کیسے ہیں؟

رفتگاں

زمانہ ختم ہو گیا
 لہو میں تھا جو رقصِ والہانہ ختم ہو گیا

گرچہ برس کے بادلوں کے قافلے گُذر گئے
 وہ منہ زلیں گُذر گئیں، وہ فاصلے گُذر گئے
 زمیں سے آسماں تک اک حلسم اک فسانہ تھا
 فسانہ ختم ہو گیا

تمام رات مُشرقی کی انجمن بھی رہی
 فضا میں دُور دُور اشرفی کے ڈھیر لگ گئے
 سحر ہوئی تو چاند کا حُسنِ انہ ختم ہو گیا

سکوتِ حال میں نشاطِ آرژوانہ دھڑکنیں
 سرودِ رفتہ میں غمِ شبانہ ختم ہو گیا
 نیازِ حُسن و سوزِ عاشقانہ ختم ہو گیا
 روایتوں کا ربطِ غائبانہ ختم ہو گیا

سودا

وہ تو کیا، سب کے لئے فیصلہ دشوار نہیں
 ایک طرف برف کے ڈھیر، ایک طرف شعلہ طور
 ایک طرف ساعتِ شب، ایک طرف صبحِ نوید
 ایک طرف آگ کی زد، ایک طرف حُور و قصور
 ایک طرف لذتِ ہر رنگ سو وہ بھی فوراً
 ایک طرف وعدہٴ مند اسودہ نزدیکِ دُور

اُس کے اس طرزِ تغافل کی شکایت تو نہیں
 ہاں مگر اُس سے یہ ادنیٰ سی گزاریش ہے ضرور
 ایک چُرائے ہوئے ناپاک تبسم کے عوض
 اُس نے بیچا ہے سُگلئے اشکوں کا غرور

اندوہِ وفا

آج وہ آہنری تصویرِ جلا دی ہم نے
 جس سے اُس شرکے پھولوں کی مہک آتی تھی
 آج وہ نکمتِ آسودہ لٹا دی ہم نے
 عقل جس قصر میں انصاف کیا کرتی ہے
 آج اُس قصر کی زنجیر پلا دی ہم نے

آگ کا غذ کے چمکتے ہوئے سینے پر بڑھی
 خواب کی لہر میں بہتے ہوئے آئے ساحل
 مُسکراتے ہوئے ہونٹوں کا سُگلنا ہوا کرب
 گنگناتے ہوئے عارض کا دمکتا ہوا تہل
 جگمگاتے ہوئے آویزوں کی مبہم منداہ
 سرسراتے ہوئے لمحوں کے دھڑکتے ہوئے دل

ایک دن رُوح کا ہر تار صدا دیتا تھا
 کاش ہم یک کے بھی اس جنسِ گراں کو پالیں
 قرضِ جاں دے کے مستلحِ گذراں کو پالیں
 خود بھی کھو جائیں پر اس رمزِ نہاں کو پالیں

اور اب یاد کے اس آخری پکیر کا طلسم
 قصہ رفتہ بنا، خواب کی باتوں سے ہوا
 اُس کا پیار، اُس کا بدن، اُس کا مہکتا ہوا روپ
 آگ کی نذر ہوا اور انہیں باتوں سے ہوا

وصال

وہ نہیں تھی تو دلِ اک شہرِ وفا تھا، جس میں
 اُس کے ہونٹوں کے تصور سے تشش آتی تھی
 اُس کے انکار پہ بھی پُول بکھلے رہتے تھے
 اُس کے انفاس سے بھی شمع جلی جاتی تھی

دنِ اس اُمید پہ کلتا تھا کہ دن ڈھلتے ہی
 اُس نے کچھ دیر کو بل لینے کی مُلت دی ہے
 انگلیاں برق زدہ رہتی تھیں، جیسے اُس نے
 اپنے رُخساروں کو چھونے کی اجازت دی ہے

اُس سے اک لمحہ الگ رہ کے جڑوں ہوتا تھا
 جی میں تھی اُس کو نہ پائیں گے تو مرجائیں گے
 وہ نہ ہوگی تو دُرک جائے گا پیمانہ ماہ
 تیرگی میں کہے ڈھونڈیں گے اکدھر جائیں گے

پھر مہوایہ کہ پسکتے ہوئے انگاروں میں
 ہم تو جلتے تھے مگر اس کا نیشن بھی جلا
 بجلیاں جس کی کنیزوں میں رہا کرتی تھیں
 دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ حنہ من بھی جلا
 اس میں ایک یوسفِ گم گشتہ کے ہاتوں کے سوا
 ایک زمینائے خود آگاہ کا دامن بھی جلا

فراق

ہم نے جس طرح سب توڑا ہے۔ ہم جانتے ہیں
 دل پُر خوں کی مئے ناب کا قطرہ قطرہ
 جوئے الماس تھا، دریائے شب نیاں تھا
 ایک اک بوند کے دامن میں تھی موج کوثر
 ایک اک عکسِ حدیثِ حرمِ ایماں تھا
 ایک ہی راہ پہنچتی تھی تجلی کے حضور
 ہم نے اُس راہ سے منھ موڑا ہے۔ ہم جانتے ہیں

ماہ پاروں کے طلسمات میں تیرا افسوں
 شیوہ و شعبہ در رسم و روایات میں تُو
 حرف و تقریر میں تُو، رمز و کنایات میں تُو
 خواب کی بزمِ تری، دیدہ بے خواب ترا
 صبح کے نور میں تُو، نیند بھری رات میں تُو
 دل کی دھڑکن کا ترے قُرب کے لمحوں پہ مدار
 ہم نے جس طرح تجھے چھوڑا ہے۔ ہم جانتے ہیں



• شفیق الرحمن: موجودہ اداریں شکستہ
اور صحت مند ادب کا بانی ہے۔

— ادب لطیف

• شفیق الرحمن: کے افسانے پڑھا کر شروع
رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سرخ سورت
نارنجی، یاقوتی اور زعفرانی۔

— بکشنے چند

• سارے نئے ادب میں بسے لے دے کے ایک
شفیق الرحمن صاحب ہیں جنہوں نے تفریحی ادب
کی طرف توجہ کی ہے۔ یہ شگفتگی، یہ لا ابالی
ہنس، یہ چلتی ہوئی جگلاہٹ ہیں انہیں کا حست
ہے۔ — محمد حسن علی

شفیق الرحمن
کے ہنستے ملکاتے مجھے

* حقیقی
* مزید حقیقی
* پرواز
* افسانے

• شفیق الرحمن کی کہانیوں میں
حکمت اور پیچیدگیاں نہیں ہر
ان کے۔ مافی اور شگفتہ
افسانوں میں بہت سادگی اور
روانی ہے۔

حجاب امتیاز علی تاج

ناشر: مکتبہ میری لائبریری لاہور